دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۵ ماہ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۱۰ء عدد ۳

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

گذشتہ چند برسوں کی طرح اس سال بھی خلیج کے علاقہ میں کچھ دنوں قیام کا موقع ملا۔ زیادہ قیام مسقط میں رہا اور کچھ وقت امارات میں بھی گذرا۔ گذشتہ سال کی طرح اس سال بھی اس ذاتی سفر کو ممکنہ حد تک دارالمصنّفین کے تعارف کے لئے استعمال کیا گیا، جہاں بھی موقع ملا اور جو فورم بھی دستیاب ہوا اسے دارالمصنّفین کے مقاصد تاسیس، اس کی خدمات، ملی تشخص کے بقا و استحکام کے لئے ایسے اداروں کی ضرورت اور اس کی موجودہ صورت حال سے لوگوں کو روشناس کرانے کے لئے استعمال کیا گیا۔ اب تو کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ: کوئی مجلس ہو ہم تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں۔ جن حالات میں راقم حروف کو اس عظیم ملی ادارہ کی ذمہ داری تفویض ہوئی اور ان تکلیف دہ حالات کے جو اثرات دل و دماغ پر مرتسم ہوئے اس کا شاید یہ فطری تقاضا ہے کہ ہمہ وقت یہی فکر اور ہمہ آن یہی ذکر دل و دماغ پر حاوی رہے۔

جب دارالمصنّفین کی تاسیس ہوئی تھی اس وقت کم از کم برصغیر میں مسلمانوں کا ایسا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا۔ ایک صدی کا طویل عرصہ گذرنے کے بعد بھی صورت حال میں کوئی بہت نمایاں تبدیلی نہیں آئی اور عام طور پر اس طرح کے اداروں کی ضرورت اور اہمیت کا چنداں احساس بھی نہیں پایا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے اداروں کو وہ مقام نہیں دیا جاتا جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہوتے ہیں، حالاں کہ کسی بھی قوم کی تعمیر و ترقی اور ذہنی و اخلاقی بالیدگی کے لئے صحت مند اور اعلی درجہ کے لٹریچر کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی افراد کی صحت کے لئے متوازن غذا کی۔

اس خطہ کے شدید مالی بحران اور معاشی عدم استحکام کے باوجود گذشتہ سفر، جس کی کسی قدر مفصل رپورٹ ان صفحات میں پیش کی جا چکی ہے، اکیڈمی کی تعمیر نو کی مہم میں ایک اہم موڑ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ گذشتہ ایک سال کے عرصہ میں اکیڈمی میں صوری اور معنوی دونوں سطح پر بنیادی نوعیت کی جو تبدیلیاں آئی ہیں ان میں اگر چہ دوسرے عوامل کی کارفرمائی سے یکسر صرف نظر نہیں کیا

جاسکتا لیکن واقعہ یہ ہے اس سلسلہ میں اس سفر کے نتائج کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اکیڈمی کی تعمیر نو اور اس کی عظمت رفتہ کی بازیافت کا آغاز وسائل کے یکسر فقدان کے باوجود اللہ کی مدد کے سہارے مارچ ۲۰۰۸ ہی میں کردیا گیا تھا، لیکن فطری طور پر اس کی رفتار بہت سست تھی۔ اگرچہ یہ سفر روایتی طور پر معروف چندہ کا سفر نہیں تھا اور نہ ہی اس انداز پر چندہ اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی تاہم یہ بات بذات خود تکلیف اور رنج کی باعث ہے کہ دارالمصنّفین جیسے ادارے کو اس کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے بڑے بڑے ملی کام چندوں ہی کے ذریعہ انجام پاتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں مسلم اقتدار کے زوال کے بعد ملی کاموں کی تکمیل کا یہی ایک ذریعہ رہ گیا ہے، لیکن دور حاضر کے طالع آزماؤں کے ہاتھوں اس کی بڑی بے توقیری ہوئی ہے۔ اسی لئے سفر کے دوران بنیادی طور پر اکیڈمی کے تعارف پر اکتفا کیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں فطری طور پر اکیڈمی کی گراں قدر خدمات اور اس کے ذریعہ تیار کئے گئے عظیم الشان لٹریچر کے لئے اعتراف اور استحسان کے جذبات اور اس کی موجودہ صورت حال پر تاسف اور تکلیف کے احساسات بیدار ہوئے۔ اس طرح دست سوال دراز کرنے کی شرمندگی نہیں اٹھانی پڑی۔

جن اسباب کے زیر اثر اور جن ناگزیر ضروریات کے باعث گذشتہ سفر کیا گیا تھا حالات میں بہت کچھ بہتری کے باوجود وہ ہنوز باقی تھیں۔ اس کے باوجود اس سال کے سفر کا اساسی مقصد گذشتہ تعاون کے لئے اپنے کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر تھی کہ اکیڈمی کی تعمیر نو کے محاذ پر ہونے والی پیش رفت سے بھی ان کو آگاہ کیا جائے۔ کرم فرماؤں کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرنے کی سعادت تو ضرور حاصل ہوئی لیکن اکیڈمی کی تعمیر و ترقی کے بارے میں کچھ کہنے سننے کا موقع کم ہی ملا۔ خلیجی ممالک سے اعظم گڑھ آنے اور جانے والوں کا ایک سلسلہ سا لگا رہتا ہے۔ اس دوران بعض ان احباب کو بھی سفر کا اتفاق ہوا جو اس مہم سے وابستہ رہے تھے۔ اس تعلق خاطر کے باعث وہ اکیڈمی بھی تشریف لائے اور وہاں کے حالات کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا اور اپنے دوران قیام اس سلسلہ میں جو کچھ سنا واپسی پر اپنے حلقوں میں اس کا ذکر کیا۔

چنانچہ اکیڈمی سے تعلق خاطر رکھنے والوں کو وہاں مختلف محاذوں پر ہونے والی پیش رفت کے بارے میں بڑی حد تک پہلے ہی سے واقفیت تھی۔ بعض پہلوؤں سے متعلق مزید تفصیلات فراہم کرنے اور مستقبل کے منصوبوں سے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچانے کے علاوہ اس سلسلہ میں کوئی خاص کام باقی نہیں بچا تھا۔ اس احسان عظیم کے لئے اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ یہ بلاشبہہ متعلقین و وابستگان دارالمصنّفین کی شب و روز کی کاوش کا ثمرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اس کے لئے بہترین اجر سے نوازے۔ آمین!

لوگوں نے اپنی افتادطبع، ذوق اور پسند کے لحاظ سے اکیڈمی میں چل رہے کاموں کے بارے میں اپنے تاثرات اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ کسی کو کیمپس کی صفائی ستھرائی اچھی لگی۔ کسی کو عمارتوں خصوصاً اکیڈمی کی خوبصورت لائبریری کا رنگ و روغن پسند آیا۔ کسی کو لان اور پھولوں کے قطعوں نے متاثر کیا۔ بہت سے لوگوں نے اکیڈمی کی کتابوں کی نئی اور معیاری طباعت کو بہ نظر استحسان دیکھا۔ کچھ لوگوں نے اکیڈمی کے اسٹاف کے حالاتِ ملازمت کو بہتر بنانے کی کوششوں کو اہمیت دی۔ سالانہ سیرت سیمنار کے انعقاد سے متعلق فیصلہ کا خیر مقدم کیا گیا اور اسے اکیڈمی کی تاسیس کے بنیادی مقصد کی توسیع قرار دیا گیا۔ البتہ بحیثیت مجموعی غالباً سب سے زیادہ دلچسپی اکیڈمی کی کتابوں کے ہندی اور انگریزی تراجم کے منصوبہ کے سلسلہ میں ظاہر کی گئی۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ ہندی تراجم کے منصوبہ کی ابتدا سیرت پاک پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مشہور کتاب 'رحمت عالم' کے ہندی ترجمہ کی اشاعت سے ہوچکی۔ 'سیرت عائشہؓ' کا انگریزی ترجمہ تکمیل کے آخری مراحل میں ہے اور انشاء اللہ اس کی اشاعت کا جلد اہتمام کیا جائے گا۔ ہندی اور انگریزی تراجم کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا۔ عام احساس یہ تھا کہ یہ وقت کی ایک بڑی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام بزرگوں اور دوستوں کو بہترین اجر سے نوازے جنھوں نے دامے، درمے، قدمے، سخنے اس مہم میں حصہ لیا اور اسے کامیاب بنایا۔

مقالات

حفاظتِ قرآن اور روایات میں منقول "قرآنی آیات" ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر محمد اکرم وِرک

اسلام کو مذاہب عالم پر جو خصوصی امتیازات حاصل ہیں ان میں سے ایک امتیاز یہ ہے کہ اس کی تعلیمات ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہیں، قرآن مجید آج بھی بالکل اسی حالت میں موجود ہے جیسا کہ حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا تھا، کیونکہ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ تاریخ ادیان میں استثنائی طور پر قرآن وہ واحد مذہبی کتاب ہے جس کی حفاظت نہ صرف حفظ اور کتابت کے ذریعہ کی گئی بلکہ قرآن مجید کو ایک ہزار سال سے بھی زائد عرصہ تک اسلامی ریاست کا قانون ہونے کی وجہ سے ہر طرح کا تحفظ حاصل رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے خاص تکوینی نظام کے تحت مسلم حکومتوں کے اقتدار کا سورج اس وقت غروب ہوا جب چھاپہ خانے اور جدید پرنٹنگ کی دریافت نے قرآن مجید میں لفظی تحریف کے امکان کو بالکل ختم کر دیا تھا۔ قرآن کے مقابلے میں یہ امتیاز اور کسی بھی مذہبی کتاب کو حاصل نہیں ہے اور نہ ہی کسی مذہب کے پیروکار یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ان کی مذہبی کتب غیر محرف ہیں۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو یہ کتب جن زبانوں میں نازل ہوئی تھیں وہ زبانیں ہی کب کی مر چکی ہیں اور آج تورات اور انجیل جن کی اصل زبان عبرانی اور سریانی تھی، نامعلوم ترجمہ در ترجمہ کے کتنے مراحل طے کر چکی ہیں۔

بنی اسرائیل پر ابتلاء اور غلامی کے جو طویل ادوار گزرے ہیں اس دوران یہ کتابیں کئی بار لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوئیں اور پھر بعد کے لوگوں نے ان کو کن مصادر کی روشنی میں دوبارہ

شعبہ علوم اسلامیہ گورنمنٹ ڈگری کالج پیپلز کالونی، گوجرانوالہ۔

قلم بند کیا؟ یہ ساری معلومات پردہ خفاء میں ہیں، چوں کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت میں دیگر مذہبی کتابوں

کو محفوظ رکھنا شامل نہیں تھا، اس لیے ان کتابوں کی حفاظت کے وہ انتظامات نہ ہو سکے جس سے یہ کتابیں زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ سکتیں۔ اب یہ معلوم کرنا کہ ان الہامی صحائف میں حق کس قدر باقی ہے اور باطل کی آمیزش کتنی ہوئی ہے ممکن نہیں ہے، اسی وجہ سے آپؐ نے اہلِ کتاب کی تصدیق اور تکذیب دونوں سے منع فرمایا ہے(۱)۔ قرآن مجید نے جابجا تورات اور انجیل میں تحریف اور غلطیوں کی نشان دہی کی ہے اور عقائد ونظریات کی درستی کے علاوہ انبیاء کے بے شمار واقعات کو مکمل اور صحیح شکل میں پیش کیا ہے۔ عصری اور اثری انکشافات نے قرآن مجید کی حقانیت پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔

مستشرقین کا اسلام پر حملہ آور ہونے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ تورات اور انجیل میں جو کمزوریاں محسوس کرتے ہیں یا قرآن ان کتابوں میں جن غلطیوں کی نشان دہی کرتا ہے وہ اعتراضات کو قرآن پر لوٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً بائبل میں تحریف کو خود یہودی اور عیسائی علماء نے تسلیم کیا ہے تو کوشش یہ ہے کہ کسی طرح یہ تحریف قرآنی متن میں بھی ثابت کی جائے۔ مستشرقین بعض روایات کو غلط رنگ میں پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس طرح بائبل کے مختلف Versions ہیں اسی طرح قرآن مجید کا متن بھی متفقہ اور ایک نہیں ہے۔ اس مہم کا آغاز کرنے والوں میں جارج سیل (George Sale) کا نام بہت نمایاں ہے اور آرتھر جیفری (Arthur Jeffery) نے تو اس مہم کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا(۲)۔

مستشرقین کا طریقۂ تحقیق یہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنا سفر مدح و توصیف سے شروع کرتے ہیں اور غیر محسوس انداز سے قاری کے ذہن میں شکوک وشبہات کی تخم ریزی کرتے ہیں اور پھر دور از کار تاویلات کے ذریعے اپنے طے کردہ نتائج پیش کر کے قارئین کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بقول سید ابوالحسن علی ندویؒ ''وہ خوردبین سے دیکھتے ہیں اور اپنے قارئین کو دوربین سے دکھاتے ہیں''، وہ تمام روایات جن کو قرآن مجید میں تحریف کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے ان میں سے اکثر روایت اور درایت کے محدثانہ اصولوں پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے قابل استدلال ہی نہیں اور جو روایات اصول صحت کی کسوٹی پر پورا اترتی ہیں ان کی درست تاویل کو اختیار کرنے سے عمداً اجتناب کیا گیا ہے۔ ذیل میں چند ایسی روایات کا

انتخاب کیا گیا ہے جو معتبر کتب حدیث میں موجود ہونے کی وجہ سے خاص طور پر منکرین حدیث اور مستشرقین کی تنقید کا نشانہ بنی ہیں۔

کیا قرآن میں آیت رجم تھی؟ بظاہر حفاظت قرآن کے عقیدہ سے متصادم بعض روایات کو بنیاد بنا کر منکرین حدیث، احادیث رسولؐ کا انکار کر دیتے ہیں جب کہ مستشرقین ایسی روایات کی بنیاد پر متن قرآن مجید کے غیر محفوظ اور نامکمل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اگر ان روایات کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو یہ دعویٰ اپنا وزن کھو دیتا ہے۔سب سے پہلے ہم اس روایت کا تنقیدی مطالعہ کریں گے جس میں حد رجم کا ذکر اس اسلوب میں ہے گویا وہ قرآن ہی کی ایک آیت تھی جو درج ہونے سے رہ گئی۔حضرت سعید بن المسیبؒ (م ۹۴ھ) سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ (م ۲۳ھ) نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لولا ان یقول الناس زاد عمر بن الخطابؓ فی کتاب اللّٰہ تعالیٰ لکتبتھا بیدی (اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ فَارْجُمُوْھُمَا اَلْبَتَّۃَ) فانا قد قرأناھا۔ (۳)

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر لوگوں کے یہ کہنے کا اندیشہ نہ ہوتا کہ عمر نے کتاب اللہ میں اضافہ کر دیا تو میں اپنے ہاتھ سے لکھ دیتا ''بوڑھے (شادی شدہ مرد) اور بوڑھی (شادی شدہ عورت) اگر زنا کریں تو انہیں ضرور رجم کرو''۔ ہم نے اس (آیت) کو خود پڑھا ہے۔

اس روایت پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اگر اس کو درست تسلیم کر لیا تو پھر قرآن مجید کی محفوظیت کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے اور چوں کہ یہ روایت قرآن مجید کی واضح نص (اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ) کے خلاف ہے اس لیے نا قابل تسلیم ہے۔(۴)

اس روایت میں جو الفاظ نقل ہوئے ہیں ان کا تعلق حضرت عمرؓ (م ۲۳ھ) کے ایک مشہور خطبے سے ہے جسے امام بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) اور امام مسلمؒ (م ۲۶۱ھ) نے بھی نقل کیا ہے لیکن شیخین (بخاری و مسلم) میں سے کسی نے بھی ان الفاظ کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی بخاری و مسلم کی روایت میں حضرت عمرؓ کی طرف سے قرآن مجید میں کسی اضافے کے ارادے کا ذکر ہے، صحیح بخاری کی

روایت یوں ہے:

لقد خشیت أن یطول بالناس زمان حتی یقول قائل : لا نجد الرجم فی کتاب اللّٰہ ، فیضلّوا بترک فریضة انزلها اللّٰہ ، الا وان الرجم حق علی من زنی وقد احصن اذا قامت البینة ، او کان الحمل ، او الاعتراف ، الا وقد رجم رسول اللّٰہ ﷺ ورجمنا بعدہ ۔ (۵)	مجھے ڈر ہے کہ لوگوں پر طویل زمانہ گزر جائے تو وہ یہ کہنے لگیں کہ ہم رجم کا حکم اللہ کی کتاب میں نہیں پاتے ۔ اس طرح اللہ کے نازل کیے ہوئے ایک فریضے کو چھوڑ کر گم راہ ہو جائیں ۔ خوب سن لو کہ رجم اس شخص پر ضروری ہے جو محصن ہونے کے باوجود زنا کرے ۔ جب کہ اس کے زنا پر گواہیاں قائم ہو گئی ہوں یا حمل ہو یا مجرم اعتراف کر لے ۔ خوب سن لو کہ رسول اللہؐ نے بھی رجم کیا ہے اور آپؐ کے بعد ہم نے بھی ۔

اس روایت پر حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:

ولعل البخاری هو الذی حذف ذلک عمدا ، فقد اخرجه النسائی ثم قال لا اعلم احداً ذکر فی هذا الحدیث الشیخ والشیخة غیر سفیان ، وینبغی ان یکون وهم فی ذلک ، قلت: وقد اخرج الائمة هذا الحدیث من روایة مالک و یونس و معمر و صالح بن کسیان وعقیل و غیر هم من الحفا ظ عن الزهری فلم یذ کرو ها ، وقد	شاید امام بخاریؒ نے اس حصے کو عمداً حذف کر دیا ہے کیوں کہ امام نسائیؒ نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ میرے علم میں اس حدیث کے اندر (اَلشَّیُخُ وَالشَّیُخَةُ ...... الخ) کا ذکر کرنے والا سفیان کے سوا کوئی نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرے کو نقل کرنے میں ان سے وہم ہوا ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کو بڑے بڑے ائمہ نے امام مالکؒ، یونسؒ، معمرؒ، صالح بن کیسانؒ وغیرہم جیسے حفاظ کی سند سے اور انہوں نے امام زہریؒ سے روایت کیا ہے لیکن ان میں سے

وقعت هذه الزيادة فی هذا الحديث من رواية الموطأ عن يحیٰ بن سعيد عن سعيد بن المسيب ...... الخ ـ (۶)	کسی نے یہ اضافہ ذکر نہیں کیا۔ ہاں اس حدیث میں یہ اضافہ موطا میں یحیٰ بن سعید سعید بن مسیّب کی سند سے مروی ہے۔

ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) کے مطابق امام بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) اور امام نسائی (م ۳۰۳ھ) جیسے محدثین نے خطبے کے اس حصے کو مستند نہیں سمجھا امام بخاریؒ نے ''باب رجم الحبلی'' میں یہ طویل خطبہ روایت کیا ہے لیکن (اَلشَّيۡخُ وَالشَّيۡخَةُ فَارۡجُمُوۡهُمَا اَلۡبَتَّةَ) والے فقرے کو نقل نہیں فرمایا، جب خطبے کا یہ حصہ مستند ہی نہیں تو اعتراضات کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ تاہم اگر حضرت عمرؓ (م ۲۳ھ) کی طرف ان الفاظ کی نسبت کا صحیح ہونا ثابت ہو جائے جیسا کہ موطا کی روایت ظاہر ہوتا ہے تب بھی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا کہ حضرت عمرؓ مذکورہ فقرے کو قرآن کریم کے جزء کے طور پر لکھنا چاہتے تھے۔ بلکہ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ زانی محصن کو رجم کرنے کا حکم منسوخ نہیں ہوا بلکہ اب بھی واجب العمل ہے، امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) نے حضرت عمرؓ کا یہ خطبہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

لو لا ان يقول قائلون : زاد عمرؓ فی کتاب اللّٰه ما ليس منه لکتبته فی ناحية من المصحف ـ (۷)	اگر کہنے والوں کے یہ کہنے کا اندیشہ نہ ہوتا کہ عمر نے اللہ کی کتاب میں اس بات کا اضافہ کر دیا جو اس کا حصہ نہ تھی تو رجم کا یہ حکم میں مصحف کے ایک گوشے میں لکھ دیتا۔

یعنی انہوں نے محض ایک تشریحی اضافے کے طور پر اس کو حاشیے پر لکھنے کا خیال مسئلہ رجم کی اہمیت جتلانے کے لیے ظاہر کیا تھا اور عمل اس پر بھی نہیں کیا، کیوں کہ اس سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔

علامہ زرقانیؒ (م ۱۱۲۲ھ) اس روایت کی شرح میں لکھتے ہیں:

''اور جو بات بالکل واضح ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی مراد ظاہری معنی نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد اس مسئلے کی اہمیت واضح کرنا اور رجم پر ابھارنا تھا، حضرت عمرؓ کا

یہ مقصد نہیں تھا کہ الفاظ کی منسوخی کے باوجود یہ آیت باقی رہنے والی ہے، آپ جیسے فقیہ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ انہوں نے الفاظ کی منسوخی کے باوجود اس آیت کو (قرآن مجید میں) لکھنے کا حکم دیا ہوگا، لہذا اس میں کوئی اشکال نہیں ہے''۔(۸)

حضرت عمرؓ کی دوراندیشی ملاحظہ فرمائیں کہ حد رجم کے بارے میں آپؓ نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا وہ درست ثابت ہوا، چنانچہ امام نوویؒ (م ۶۷۶ھ) فرماتے ہیں:

''حضرت عمرؓ کا یہ قول: میں ڈرتا ہوں کہ جب زیادہ زمانہ گزر جائے تو کوئی کہنے والا کہے کہ ہم رجم کو خدا کے مقرر کیے ہوئے حکم میں نہیں پاتے، پس لوگ ایک فرض چھوڑنے سے گمراہ ہوں گے، حضرت عمرؓ کا ڈر خوارج اور ان کی موافقت کرنے والوں کے حق میں پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے''۔(۹)

اس روایت کو محدثین نے مختلف اسناد سے نقل کیا ہے، یہ حدیث زید بن ثابتؓ (م ۴۴ھ)، عمرو بن العاصؓ (م ۴۲ھ)، عبدالرحمان بن عوفؓ (م ۳۲ھ) وغیرہم سے بھی مروی ہے۔ ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے یہ الفاظ قرآنی آیت کے طور پر ذکر نہیں فرمائے۔(۱۰)

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرے کا اصل ماخذ تورات ہے اور چونکہ اس کے مرکزی مفہوم کو اسلامی شریعت میں بھی باقی رکھا گیا تھا اور رسول اللہؐ نے اس کے مطابق فیصلے بھی فرمائے تھے، اس لیے یہ فقرہ ایک واجب العمل حکم الٰہی کی طرح زبان زد عام ہوگیا۔ اس موقف کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- حافظ ابن جریر طبریؒ (م ۳۱۰ھ) نے حضرت جابر بن زیدؓ سے نقل کیا ہے کہ یہودیوں کے رجم کے واقعہ میں جب آنحضرتؐ نے قسمیں دے کر عبداللہ بن صوریا سے پوچھا: تورات میں شادہ شدہ زانی کا حکم کیا ہے؟ تو اس نے یہ آیت پڑھی (اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ) اس پر رسول کریمؐ نے فرمایا: ''فھو ذاک''، یعنی بس یہی حکم تو چاہیے تھا۔(۱۱)

یہاں یہ اشکال باقی رہتا ہے کہ پھر اس آیت کو موجودہ تورات میں ان ہی الفاظ میں موجود ہونا چاہیے تھا جب کہ ایسا نہیں ہے تو اس آیت کے موجودہ تورات میں نہ ہونے کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ عربی لٹریچر میں عہد نامہ قدیم کے علاوہ مشنا، تلمود اور یہودیوں کی دوسری

مذہبی کتب کو بھی بعض اوقات ''تورات'' ہی کے لفظ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ لہذا یہ عین ممکن ہے کہ خاص طور پر یہ فقرہ عہد نامہ قدیم کے علاوہ کسی اور مذہبی کتاب کا ٹکڑا ہو۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عہد رسالتؐ کے بعد تورات میں ''حسب معمول'' تحریف کا سلسلہ جاری رہا ہو اور ہم تک پہنچتے پہنچتے مذکورہ آیت بھی تورات سے غائب ہو گئی ہو۔

۲- بعض روایات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے اس جملے کو بطور آیت رجم لکھنے کی اجازت نہیں دی بلکہ اسے ناپسند فرمایا، چنانچہ صحابہ کرامؓ کی ایک محفل میں مسئلہ رجم اور یہی فقرہ موضوع بحث تھا۔ حضرت عمرؓ اٹھ کر آنحضرتؐ کی خدمت میں گئے اور عرض کیا:

یا رسول اللّٰہ ﷺ اکتبنی آیة	یارسول اللہؐ: مجھے آیت رجم لکھوا دیجیے، آپؐ
الرجم ، قال :لا استطیع ذاک ۔(۱۲)	نے فرمایا: میں ایسا نہیں کر سکتا۔

حضرت عمرو بن العاصؓ (م ۴۲ھ) فرماتے ہیں:

لما نزلت اتیت النبی ﷺ	جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں آنحضرتؐ کے پاس
فقلت : اکتبھا فکانہ کرہ	حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپؐ اس آیت کو لکھوا دیجیے
ذلک۔ (۱۳)	تو آپؐ نے میرے اس مطالبے کو ناپسند فرمایا۔

اگر یہ قرآن کریم کی آیت ہوتی تو آپؐ اس کو دوسری آیات کی طرح ضرور لکھواتے لیکن آپؐ نے ابتداء ہی سے اس کو لکھوانے سے انکار فرمایا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہ الفاظ قرآن کریم کا جزء کبھی نہیں رہے اور جن روایات میں اس کو نازل ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کے جزء کے طور پر نازل ہوئی تھی بلکہ مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو بذریعۂ وحی مطلع کیا گیا تھا کہ یہ آیت تورات میں موجود ہے اور مسلمانوں کے لیے اب بھی قابل عمل ہے۔(۱۴)

اس ضمن میں غلط فہمی کی ایک وجہ الفاظ ''کتاب اللہ'' ہیں، کیونکہ کتاب اللہ سے عموماً قرآن مراد لیا جاتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ قرآن وسنت میں ان الفاظ کو کسی دوسرے مفہوم کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے تاکہ اس بات کا جائزہ لیا جا سکے کہ حضرت عمرؓ کا کتاب اللہ کہنے سے کیا مطلب تھا؟

قرآن مجید میں ''کتاب'' کا لفظ ''خط'' (۱۵)، ''نوشتۂ تقدیر'' (۱۶)، ''فریضہ'' (۱۷)، ''صحیفہ'' (۱۸) وغیرہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح کتاب اللہ کے معنی حکم اللہ کے بھی ہیں، گو وہ حکم قرآن مجید میں واضح طور پر موجود نہ بھی ہو۔ کتاب اللہ کا اطلاق جس طرح قرآن پر ہوتا ہے اسی طرح اللہ کے احکام اور فرائض پر بھی کتاب اللہ کا لفظ بولا جاتا ہے، بندوں پر جو فرائض قرآن میں یا سنت میں ہیں ان سب پر کتاب اللہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

یَـا قَوۡمِ ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَةَ	اے میری قوم! اس مقدس زمین میں داخل
الَّتِیۡ کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمۡ ۔(المائدہ:۲۱)	ہوجاؤ جسے اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔

یہ مفہوم حدیث سے بھی ثابت ہے۔ صحاح ستہ میں ایک روایت مختلف الفاظ کے ساتھ موجود ہے کہ ایک شخص آپ ؐ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہؐ! میں آپ ؐ کو قسم دے کر کہتا ہوں کہ ہمارا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کر دیجیے۔ اب دوسرا فریق جو پہلے سے کچھ زیادہ سمجھدار تھا، کہنے لگا کہ ہاں رسول اللہؐ! ہمارا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق فرمائیے اور مجھے بات کرنے کی اجازت دیجیے، آپ ؐ نے فرمایا: اچھا بیان کر، اس نے کہا: میرا بیٹا اس شخص (فریق ثانی) کے پاس نوکر تھا اور اس نے اس شخص کی بیوی سے زنا کیا ہے، میں نے سو بکریاں اور ایک غلام دے کر اپنے بیٹے کو چھڑا لیا، اس کے بعد میں نے کئی لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ تیرے بیٹے کے لیے سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور اس شخص کی بیوی کے لیے ''رجم'' ہے۔ نبی کریمؐ نے یہ سن کر فرمایا:

والذی نفسی بیده لا قضین	اس پروردگار کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری
بینکما بکتاب اللّٰه جل ذکره ،	جان ہے اور جس کا ذکر بلند ہے، میں تم دونوں
المائة شاة والخادم رد ، وعلی	کے درمیان ''کتاب اللہ'' کے مطابق فیصلہ
ابنک جلد مائة و تغریب عام ،	کروں گا۔ سو بکریاں اور غلام (جو تو نے دیے)
واغد یا انیس علی امراة هذا ،	تجھے واپس ہوں گے اور تیرے بیٹے کی سزا سو
فان اعترفت فارجمها فغدا علیها	کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور اے

فاعترفت فرجمها ۔(۱۹)	انیس! کل صبح اس عورت کے پاس جاؤ، اگر وہ زنا کا اعتراف کرے تو اسے رجم کردو۔ چنانچہ انیس صبح اس کے پاس گئے تو اس نے اعتراف کرلیا تو انہوں نے اسے رجم کر دیا۔

علامہ بدرالدین عینیؒ (م ۸۵۵ھ) نے مذکورہ بالا حدیث کی شرح میں شیخ زین الدین عراقیؒ کا قول نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

المراد به القرآن يحتمل كلا الامرين ۔(۲۰)	کتاب اللہ سے مراد اللہ کے احکام اور فرائض ہیں جیسا کہ اس سے مراد قرآن لیا جاتا ہے۔

واضح ہوا کہ رسول اللہؐ نے رجم کا فیصلہ حکم الٰہی کے مطابق دیا، اگرچہ قرآن میں رجم کا حکم نہیں ہے، گویا حدیث رسولؐ پر ''کتاب اللہ'' کا اطلاق کرنا خود نبی کریمؐ سے ثابت ہے، لہٰذا حضرت عمرؓ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں خطبہ دیتے ہوئے جب یہ فرمایا:

الرجم في كتاب الله حق على من زنى اذا احصن من الرجال والنساء ۔ (۲۱)	رجم کا حکم کتاب میں حق اور ثابت ہے جب کہ شادہ شدہ مرد اور عورت زنا کرے۔

تو یہاں بھی کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر مستشرقین، منکرین حدیث اور دیگر معترضین نے سمجھا ہے، بلکہ پوری شریعت بشمول حدیث رسولؐ ہے، کیونکہ صحابہ کرام کتاب اللہ سے پوری شریعت ہی مراد لیا کرتے تھے اور وہ حدیث رسول اللہؐ کو قرآن مجید سے علاحدہ چیز تسلیم نہیں کرتے تھے۔ صحابہ کرام کا عقیدہ اور نقطہ نظر یہ تھا کہ حضورؐ کی ہدایات بھی وحی الٰہی کے ہی تابع ہیں اس لیے وہ احادیث رسولؐ پر ''کتاب اللہ'' کا اطلاق کر دیا کرتے تھے، اس کی نظیر ابن مسعودؓ کی ایک روایت میں بھی ملتی ہے جب آپؓ نے بنو اسد کی خواتین کو مخاطب کر کے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایسی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو سرمہ بھرتی ہیں، بال اکھیڑتی ہیں اور حسن ہی کے لیے دانتوں میں فاصلہ کرتی ہیں اور یوں وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ تو بنی اسد کی ام یعقوب نامی عورت آپؓ کے پاس

آئی اور کہنے لگی:

بلغنی انک قلت : کیت وکیت ، قال : ومالی لا العن من لعن رسول اللّٰہ ﷺ فی کتاب اللّٰہ عز و جل فقالت : انی لاقرا ما بین لوحیہ فما وجدتہ قال : ان کنت قراتیہ ، فقد وجدتیہ اما قرات (مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَانَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ۔ ۵۹/۷) قالت : بلی ، قال : فان النبی ﷺ نھی عنہ۔(۲۲)	مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم (عورتوں کے متعلق) ایسی اور ایسی باتیں کرتے ہو،تو آپ نے فرمایا میں ایسے شخص کو لعن کیوں نہ کروں جس پر اللہ کے رسول اللہؐ نے لعنت کی ہے اور کتاب اللہ میں بھی یہ بات ہے، عورت نے کہا: میں نے سارا قرآن پڑھا ہے لیکن یہ مسئلہ کہیں نظر نہیں آیا۔آپ نے فرمایا: اگر تو اسے (گہری نظر) سے پڑھتی تو ضرور اس میں یہ بات پاتی۔کیا تو نے یہ آیت تلاوت نہیں کی :''اور اللہ کے رسولؐ جو (حکم) تمہیں دیں اس کو پکڑ لو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ'' اس نے کہا: یہ آیت تو پڑھی ہے،آپ نے فرمایا: تو اس کام سے بھی آپؐ نے منع فرمایا ہے۔

ایک دوسری سند جس میں مسروقؒ نے ابن مسعودؓ (م ۳۲ھ) سے یہی روایت بیان کی ہے، یہ الفاظ ہیں کہ اس عورت نے ابن مسعودؓ سے کہا: اشئی تجدہ فی کتاب اللّٰہ ام سمعتہ عن رسول اللّٰہ ﷺ ؟ فقال : اجد فی کتاب اللّٰہ وعن رسول اللّٰہ ﷺ ۔ (۲۳)

حالانکہ عورتوں کے بارے میں ابن مسعودؓ کی بیان کردہ اس تنبیہ اور ہدایت کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے حدیث رسولؐ پر بھی ''کتاب اللہ'' کا اطلاق کیا، کیونکہ صحابہ کرام حدیث اور سنت رسولؐ کو حکم الٰہی کا قولی اور عملی اظہار ہی سمجھتے تھے۔اسی لیے صحابہ کرام بسا اوقات قول رسولؐ کے لیے ''کتاب اللہ'' کے لفظ کو برحق سمجھتے تھے۔الغرض زیر بحث روایت میں بھی حضرت عمرؓ نے فرمان رسولؐ کے لیے ''کتاب اللہ'' کی تعبیر اختیار کی حالانکہ

وہ اس کو قرآن کا جزء نہیں سمجھتے تھے۔

کیا آیت رضاعت قرآن مجید کا حصہ تھی؟

حضرت عائشہؓ (م ۵۷ھ) سے مروی ہے:

کان فیما انزل من القرآن : عشر رضعات معلومات یحرمن ، ثم نسخن: بخمس معلومات ، فتوفی رسول اللہ ﷺ وھی فیما یقرأ من القرآن ۔(۲۴)	قرآن مجید میں پہلے یہ نازل ہوا تھا کہ دس چسکیوں سے حرمت لازم آتی ہے پھر یہ حکم منسوخ ہوگیا اس کے بعد پانچ چسکیوں سے حرمت کا حکم ہوا اور رسول اللہؐ کے وصال تک قرآن مجید میں اسی طرح پڑھا جاتا تھا۔

اس روایت پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ حضرت عائشہؓ کے قول فتوفی رسول اللہ ﷺ وھی فیما یقرأ من القرآن سے اس آیت کی تلاوت کے باقی رہنے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، حالانکہ موجودہ قرآن میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز عقیدۂ حفاظت قرآن کے خلاف ہے اور تحریف کے زمرے میں آتی ہے لیکن اگر اس روایت پر درج ذیل پہلوؤں سے غور کیا جائے تو تمام اشکال دور ہوجاتے ہیں:

۱- اس روایت سے قرآن مجید کی محفوظیت اور حقانیت پر کوئی حرف نہیں آتا کیوں کہ یہ روایت خبر واحد ہے جب کہ قرآن کی ہر آیت خبر متواتر، توارث اور اجماع امت کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہے۔

۲- یہ ایک منسوخ آیت ہے۔ امام نوویؒ (م ۶۷۶ھ) صحیح مسلم کی شرح میں اس کو ان آیات میں شمار کرتے ہیں جن کی تلاوت منسوخ ہوچکی ہے تاہم ان کے نزدیک اس کا حکم باقی ہے، امام نوویؒ فرماتے ہیں:

والنسخ ثلاثة انواع ، احدھا ما نسخ حکمه وتلاوته کعشر رضعات والثانی ما نسخت تلاوته دون حکمه کخمس رضعات و کالشیخ والشیخه اذا زنیا	نسخ کی تین قسمیں ہیں: پہلی یہ کہ کسی آیت کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوجائیں، مثلاً عشرۃ رضعات کا مسئلہ ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اس کی صرف تلاوت منسوخ ہو لیکن حکم باقی ہو۔ اس کی مثال خمس رضعات اور آیت رجم ہے اور تیسری

فارجموهما والثالث ما نسخ حكمه و بقيت تلاوته وهذا هو الاكثر ۔(۲۵)

قسم یہ ہے کہ اس کا حکم منسوخ ہوگیا لیکن اس کی تلاوت باقی رہ گئی، اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) کا بھی اس روایت کے بارے میں یہی موقف ہے، چنانچہ وہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے، انہوں نے اس روایت کا ذکر ان آیات میں کیا ہے جن کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہو چکے ہیں۔(۲۶)

تاہم یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اگر یہ منسوخ آیات میں سے ہے تو حضرت عائشہؓ کے الفاظ فتوفی رسول اللّٰه ﷺ وهی فیما یقرا من القرآن کا کیا مطلب ہے؟ امام نوویؒ ان الفاظ کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وقولها : فتوفی رسول اللّٰه ﷺ وهی فیما یقرا من یقرا ؟ ومعناه ان النسخ بخمس رضعات تاخر انزاله جدا حتی انه ﷺ توفی و بعض الناس یقرا خمس رضعات ویجعلها قرآنا متلواً لکونه لم یبلغه النسخ لقرب عهده ﷺ ، فلما بلغهم النسخ بعد ذلک رجعوا عن ذلک واجمعوا علی ان هذا لا یتلی ۔(۲۷)

حضرت عائشہؓ کا قول یہ ہے کہ رسول اللہؐ وفات پاگئے اور یہ آیات قرآن کریم میں تلاوت کی جارہی تھیں، ان آیات کو تلاوت کرنے والے کون تھے؟ یقرا جو مجہول کا صیغہ ہے واضح کرتا ہے کہ خمس رضعات کے الفاظ کا نسخ آپؐ کے بالکل آخری دور (یعنی عرضۂ آخیرہ کے وقت) میں ہوا، یہاں تک کہ رسول اللہؐ وفات پاگئے اور بعض لوگ خمس رضعات کی آیات پڑھتے اور انہیں قرآن متلو سمجھتے رہے، کیونکہ رسول اللہؐ کے وفات پاجانے کی وجہ سے انہیں ان آیات کی تلاوت کے منسوخ ہونے کا علم نہیں ہوسکا تھا، پھر جب انہیں اس کا نسخ معلوم ہوا تو انہوں نے اس سے رجوع کرلیا اور اس کی تلاوت کے منسوخ ہونے پر اجماع ہوگیا۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) بھی حضرت عائشہؓ کے الفاظ کی یہی تاویل کرتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے اورانہوں نے حضرت عائشہؓ کے قول وھی فیما یقرا من القرآن میں کلام کیا ہے، کیونکہ اس قول کے ظاہر سے تلاوت کے باقی رہنے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے حالاں کہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے یعنی اس کی قرأت ختم ہوگئی تھی اور حکم باقی نہیں رہا تھا، ان الفاظ کی تاویل یوں کی گئی ہے کہ فتوفی سے یہ مراد ہے کہ حضورؐ کی وفات کا وقت قریب آ گیا تھا یا یہ کہ تلاوت منسوخ ہوگئی تھی مگر تمام لوگوں کو یہ بات آپؐ کی وفات کے بعد ہی معلوم ہوئی، اس لیے نادانستگی کی وجہ سے بعض لوگ ان آیات کو آپؐ کی وفات تک پڑھتے اور تلاوت کرتے رہے۔(۲۸)

۳- اگرچہ مذکورہ بالا توجیہ کے بعد اس روایت کے مفہوم میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا تاہم یہاں ایک اور امکان پر بھی غور کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ ''رسول اللہؐ کے وصال تک قرآن مجید میں اسی طرح پڑھا جاتا تھا'' یہ الفاظ کسی بعد کے راوی کے ہیں کیوں کہ امام مسلمؒ نے زیر تبصرہ روایت کے بعد یحیٰی بن سعیدؒ کی سند سے جو دوسری روایت ذکر کی ہے اس میں فتوفی رسول اللہ کے الفاظ نہیں ہیں، جس سے یہی اشارہ ملتا ہے کہ امام مسلمؒ کی نظر میں یہ اضافہ راوی عبداللہ بن ابوبکر کا وہم ہے۔

امام طحاویؒ (م ۳۲۱ھ) فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ عبداللہ بن ابوبکر کے علاوہ اور کسی بھی راوی سے مروی نہیں ہیں اور اگر یہ الفاظ قرآن ہوتے تو یقینی طور پر اس کی تلاوت نماز میں بھی کی جاتی حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ہی قرآن میں اس کی کوئی ناسخ آیت ہے کہ ہم اس کو منسوخ آیات میں شمار کریں، اس لیے یہ سراسر راوی کا وہم ہے۔ اس کے بعد امام طحاویؒ نے یہ روایت دو مختلف اسناد کے ساتھ نقل کی ہے۔ پہلی روایت قاسم بن محمدؒ، عمرہ بنت عبدالرحمانؒ سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا:کان مما نزل من القرآن ثم سقط لا یحرم من الرضاع الا عشر رضعات ، ثم نزل بعد او خمس رضعات (۲۹) اور دوسری سند میں یحیٰی بن سعیدؒ، عمرہؒ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: انزل فی القرآن عشر رضاعات معلومات ثم انزل خمس رضاعات ۔(۳۰)

یعنی ان دونوں روایات میں فتوی رسول اللہ کے الفاظ موجود نہیں جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ الفاظ بعد کا اضافہ ہیں۔

۴- حضرت عائشہؓ کا وصال ۵۷ھ میں ہوا جب کہ قرآن مجید کی تدوین اور نشر و اشاعت کا باقاعدہ اہتمام ان کے والد محترم اور خلیفۃ الرسولؐ حضرت صدیق اکبرؓ (م ۱۳ھ) نے فرمایا اور حضرت عثمان غنیؓ (م ۳۵ھ) کے عہد خلافت میں ایک دوسرے پہلو سے قرآن مجید کے جمع کا کام ہوا۔ یہ کیسے تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت عائشہؓ نے ان دونوں موقعوں پر جامعین قرآن کو اس آیت سے غافل رکھا ہو؟ دوسری روایات میں بھی ایسا ہوا ہے کہ راوی الفاظ کو پوری طرح ضبط نہ کر سکے، تاہم دیگر روایات نے اس غلطی کو صاف کر دیا ہے۔

۵- اس روایت پر اصول درایت کی روشنی میں بھی غور کی ضرورت ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کے الفاظ کو اگر ظاہری مفہوم پر محمول کیا جائے تو اس حکم کا علم ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی ہونا چاہیے تھا اور قرآن مجید کا ایک اہم حکم ہونے کی وجہ سے اس کی شہرت عام ہونی چاہیے تھی کیونکہ عرب میں بچوں کو عموماً دایہ دودھ پلاتی تھیں۔ اس اعتبار سے اس حکم کو عرب میں خصوصی اہمیت حاصل ہونی چاہیے تھی اور یہ ممکن نہ تھا کہ یہ آیت صرف حضرت عائشہؓ تک ہی محدود رہتی۔ اگر صحیح مسلم میں کتاب الرضاع کی دوسری روایات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی صحابی کو ایسی آیت کی خبر نہ تھی بلکہ اس باب میں دیگر صحابہ کے علاوہ خود حضرت عائشہؓ کی روایات بھی موجود ہیں کہ انہوں نے رسول اللہؐ سے سوالات کیے تھے کہ کتنی بار اور کتنی عمر کی رضاعت سے حرمت قطعی ثابت ہوجاتی ہے؟ المختصر آیت رضاعت کے حوالے سے منکرین حدیث اور مستشرقین کا قرآن کے متن کے غیر محفوظ ہونے کا استدلال درست نہیں ہے۔

کیا لوکان لابن آدم وادیان الخ قرآن کی آیت تھی؟ ابوحرب بن ابی الاسودؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، جس کا ترجمہ یہ ہے:

> حضرت ابوموسیٰ اشعری نے بصرہ کے قاریوں کو بلوایا تو ان کے پاس تین سو ایسے لوگ آئے جو قرآن مجید پڑھ چکے تھے، حضرت ابوموسیٰ اشعری نے کہا: تم اہل بصرہ میں سب سے بہتر ہو اور اے قرآن پڑھنے والو! قرآن پڑھتے رہو، کہیں زیادہ مدت

گزر جانے سے تمہارے دل سخت نہ ہو جائیں جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں کے دل سخت ہوگئے تھے، ہم ایک سورت پڑھا کرتے تھے جو طول اور شدت میں سورہ توبہ کے برابر تھی مجھے وہ سورت بھلا دی گئی البتہ اس کی اتنی بات یاد رہی ہے کہ ابن آدم کے لیے مال کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کی خواہش کرے گا۔ ابن آدم کا پیٹ مٹی کے سوا کوئی اور چیز نہیں بھرتی اور ہم ایک اور سورت بھی پڑھا کرتے تھے جو مسبحات میں سے کسی ایک سورت کے برابر تھی وہ بھی مجھے بھلا دی گئی البتہ اس میں سے مجھے اتنا یاد ہے: ''اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جس کو خود نہیں کرتے تمہاری گردنوں میں شہادت لکھ لی جائے گی اور قیامت کے دن تم سے اس کے متعلق سوال پوچھا جائے گا''۔ (۳۱)

مصر کے معروف منکر حدیث محمود ابوریّہ (۳۲) نے مذکورہ بالا روایت کو اس وجہ سے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ یہ روایت حفاظت قرآن کے عقیدے سے متصادم ہے۔ اگر اس قسم کی روایات کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ معترضین غور و فکر کی زحمت گوارا نہیں کرتے ورنہ اس روایت کو درج ذیل تاویلات کی موجودگی میں قرآن مجید کی حقانیت کے خلاف قرار دینا درست نہیں:

۱- قرآن مجید تواتر سے ثابت ہے اور اس قسم کی روایات اخبار آحاد ہیں اور خبر واحد چونکہ ظنی ہوتی ہے، اس لیے یہ روایت قرآن مجید کی قطعیت کے منافی نہیں ہے۔

۲- یہ روایت خود امام مسلمؒ کی نظر میں بھی صحت کے اعلیٰ درجہ پر نہیں ہے۔ امام مسلمؒ نے صحیح مسلم کی تدوین میں جن اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے، صحیح مسلم کے مقدمہ میں اس طرح درج ہے:

> قسم اول میں پہلے ہم ان احادیث کو بیان کریں گے جن کی اسانید دوسری اسانید کی بہ نسبت عیب اور نقائص سے محفوظ ہیں، جن کے راوی معتبر، ثقہ اور قوی حافظہ کے مالک ہیں اور ان کی روایات میں شدید اختلاف اور کثیر اختلاط نہیں ہوتا اور یہ بات ان کی روایت کردہ احادیث سے پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے۔ اس قسم کے لوگوں کی روایات بیان کرنے کے بعد ہم ان روایات کا ذکر کریں گے جن کی روایت میں بعض راوی ایسے بھی ہوں گے جو قوت اور ثقاہت میں قسم اول کے پایہ کے نہیں ہوں گے،

اگر چہ تقویٰ، پرہیزگاری، صداقت اور امانت میں ان کا مرتبہ کم نہیں ہوگا۔ (۳۳)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ امام مسلمؒ نے اس باب میں پانچ روایات نقل کی ہیں اور چونکہ یہ روایت ان کی نظر میں سب سے کمزور تھی اس لیے انہوں نے اپنے اصول کے مطابق اس روایت کو سب سے آخر میں ذکر کیا ہے۔ یہ بذات خود بڑا واضح اشارہ ہے کہ امام مسلمؒ کی نظر میں یہ حدیث دوسری احادیث سے کمزور ہے۔

۳- اس باب میں امام مسلمؒ نے جو پانچ روایات نقل کی ہیں ان میں سے پہلی چار روایات میں ''لو کان لابن آدم و ادیان...... الخ ''کو قرآن کی آیات کے طور پر روایت نہیں کیا گیا۔ اس باب کی پہلی تین روایات حضرت انسؓ سے مروی ہیں۔ ان میں حضرت انس بن مالکؓ (م ۹۲ھ) سے یہ الفاظ منقول ہیں:

سمعت رسول الله ﷺ يقول : ...... "فلا ادرى اشىء انزل ام شىء كان يقوله" ۔ (۳۴)	میں نے رسول اللہؐ سے سنا'' اور مجھے یہ پتہ نہیں کہ آپؐ پر وہ بات نازل ہوئی تھی یا آپؐ ازخود فرمارہے تھے'' (باقی روایت حسب سابق ہے)۔

چوتھی روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ (م ۶۸ھ) سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں:

"فلا ادرى من القرآن هو ام لا"	مجھے معلوم نہیں کہ یہ قرآن سے ہے یا نہیں ہے۔
وفى رواية زهير قال : فلا ادرى من القرآن ، لم يذكر ابن عباس ۔ (۳۵)	زہیر کی روایت میں ہے کہ ابن عباس نے یہ الفاظ نہیں کہے کہ'' مجھے معلوم نہیں کہ یہ قرآن سے ہے کہ نہیں ہے''۔

۴- ایک اور اہم قابل غور پہلو یہ ہے کہ صحابہ کرام کی دعوتی اور تعلیمی سرگرمیوں کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ درس و تدریس کے دوران قرآنی آیات کا مفہوم اور مطلب اپنے الفاظ میں بیان کیا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ یہ مفہوم بھی عربی زبان ہی میں ہوا کرتا تھا، جس سے بعض لوگوں نے اس قسم کے تشریحی الفاظ کو بھی قرآن کی طرف منسوب کردیا۔ یہاں بھی صورت حال کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے کہ راویان حدیث نے حضرت ابوموسی اشعری کے تشریحی الفاظ کو من جملہ قرآن سمجھ لیا۔ ایک دوسری روایت سے ہمارے اس موقف کی تائید ہوتی ہے۔

صحابیٔ رسولؐ حضرت ابی بن کعبؓ کا واقعہ ہے کہ آپ سورۃ البینہ سنا رہے تھے، جب وہ (وَمَـآ اُمِـرُوْا اِلَّا لِيَـعْبُـدُوْا اللّٰـه مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ) تک پہنچے تو (مُـخْـلِـصِيْنَ لَهُ الـدِّيْـنَ) کی تشریح کرنے لگے کہ اللہ کی مرضی اور خوش نودی حاصل کرنا بھی (اَلـدِّيْـنَ) ہے اور مذہب کی خالص روح اور منشا ہے، آپؓ نے اس موقع پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

ان الـديـن عـنـد الـلّٰه الحنيفية غير الـمشـركة ولا اليهودية ولا الـنـصـرانيـة ، ومن يفعل خيرًا فـلـن يكفره ، قال شعبة : ثم قرأ آيــات بـعـدهــا ثم قرأ : "لو ان لابــن آدم واديـيـن مـن مــال ، لســأل واديًــا ثـالـثًـا ، ولا يملأ جوف ابن آدم الا التراب" قال : ثم ختمها بما بقى منها۔ (۳۶)

دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی معتبر ہے جس میں راست روی اور یکسوئی ہو (یہ حنفاء کا مطلب ہے) نہ مشرکین کا مذہب نہ یہودیت اور نہ عیسائیت، شعبہؒ کہتے ہیں: اس کے بعد انہوں نے چند آیات پڑھیں اور پھر کہا: اگر ابن آدم کے لیے مال کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کا سوال کرے گا اور ابن آدم کا پیٹ مٹی کے سوا کوئی اور چیز نہیں بھرتی، شعبہؒ کہتے ہیں: پھر آپؓ نے اس سورت کی باقی آیات مکمل کیں۔

اس روایت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کی حیثیت محض تشریحی بیان ہی کی تھی، یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ابن مسعودؓ (م ۳۲ھ) اور ابی بن کعبؓ (م ۳۰ھ) کے بارے میں مستشرقین اور منکرین حدیث نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ ان کے پاس مصحف صدیقی سے ہٹ کر قرآن کے نسخے موجود تھے، تو پھر چاہیے تھا کہ اس سورت کا ذکر ان کے ذاتی نسخوں میں موجود ہوتا، حالاں کہ انہوں نے بھی ایسی کسی سورت کا نام تک نہیں لیا۔ علامہ قرطبیؒ (م ۶۷۱ھ) نے اس روایت کے بارے میں ابوبکر الانباری (م ۳۲۷ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس روایت کو قرآن کی آیت کہنا باطل ہے۔ ابوبکر کہتے ہیں:

لان قـراتى ابن كثير و ابى عمـرو متصلان بابى بن كعب ، لا يـقـرا فيهما هذا المذكـور فى (لَـمْ يَكُنْ)

اعتبار سے) ابی بن کعبؓ تک پہنچتی ہے اور ان دونوں قراءتوں میں سورہ (لَمْ يَكُنْ) میں یہ الفاظ نہیں پڑھے جاتے، جن کا حدیث نبویؐ

مما معروف فی حدیث رسول اللّٰہ علی انه من کلام الرسول علیه السلام ، لا یحکیه عن رب العالمین فی القرآن ، وما رواه اثنان معهما الاجماع: اثبت مما یحکیه واحد مخالف مذهب الجماعة؟۔ (۳۷)

میں رسول اللہ ﷺ کا کلام ہونا معروف ہے اور آپ ﷺ نے ان الفاظ کو اللہ کے کلام کے طور پر قرآن مجید میں نہیں پڑھا۔ جب دو راوی ایک روایت کر رہے ہوں اور اجماع بھی ان کی تائید کر رہا ہو تو ان کی بات اس ایک شخص کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہے جس کی بات اجماع کے خلاف ہے۔

۵- حضرت ابوموسیٰ اشعری کے الفاظ: وانا کنا نقرأ سورة ...... الخ ''اور ہم ایک سورہ پڑھا کرتے تھے'' سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت یا سورت تمام صحابہ کرام کو یاد ہوگی، یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ کوئی آیت یا سورت قرآن کا حصہ ہو اور وہ صرف ابوموسیٰ اشعری ہی کو یاد ہو۔ یہ سورت یقیناً صحابہ کرام میں معروف ہوگی، اب اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ابوموسی اشعری کو ساری سورت بھول گئی اور صرف ایک آیت یاد رہی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کی طرح تمام صحابہ کرام کو بھی یہ سورت بھول گئی ہو کہ دوسرے صحابہ کرام نے نہ اس سورت کا نام لیا ہو اور نہ ہی اس کی موجودگی کا کبھی ذکر کیا ہو۔ عہد صدیقی میں زید بن ثابتؓ (م ۴۴ھ) کی زیرنگرانی تدوین قرآن کا کام ہوا تو اس وقت اعلان عام کیا گیا کہ جس جس کے پاس قرآن کا کوئی حصہ لکھا ہوا موجود ہو وہ مسجد نبوی ﷺ میں پیش کرے۔ اس وقت ابوموسی اشعری (م ۵۱ھ) اور نہ ہی کسی اور صحابی نے اس سورت کا ذکر کیا، اس طرح حضرت عثمانؓ کے عہد میں بھی ہوا۔ حالانکہ صحابہ کرام میں بہت سے حفاظ قرآن موجود تھے۔

کیا سورۃ الیل میں تحریف ہوچکی ہے؟ حضرت علقمہؒ (م ۶۲ھ) سے مروی ہے:

> ہم شام گئے تو حضرت ابودرداءؓ ہمارے پاس آئے اور فرمایا تمہارے پاس کوئی آدمی ہے جو عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت کے مطابق پڑھنے والا ہو؟ میں نے کہا: میں ہوں، انہوں نے پوچھا: تم نے اس آیت کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کس طرح سنا ہے: (وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰى) میں نے کہا: عبداللہ بن مسعودؓ اس

طرح پڑھتے تھے: (وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی وَالذَّکَرِ وَالْاُنْثٰی) انہوں نے کہا: اللہ کی قسم میں نے بھی رسول اللہؐ سے اسی طرح سنا ہے اور یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں (وَمَا خَلَقَ) پڑھوں مگر میں نہیں مانتا۔(۳۹)

سورۃ الیل کی ابتدائی آیات اس طرح ہیں (وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی) جب کہ اس باب میں ابن مسعودؓ کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ (وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی) کی جگہ (وَالذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی) ہے اور ظاہر ہے کہ یہ روایت قرآن مجید کی موجودہ قرأت کے خلاف ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق(۴۰) نے مذکورہ بالا روایت کو من گھڑت قرار دیتے ہوئے مشتبہ ٹھہرایا ہے۔ اس اشکال کی کئی حوالوں سے توجیہ کی جا سکتی ہے، جیسے۔

زیر تبصرہ روایت، شاذ قرأت پر مشتمل ہے جو اب منسوخ ہو چکی ہے اور چوں کہ یہ قرأت خبر واحد سے ثابت ہے جب کہ قرآن خبر متواتر سے ثابت ہے، اس لیے اس روایت سے قرآن مجید کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ امام طبریؒ اس قرأت شاذہ کی وجہ سے آیت (وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی) کے معنی میں جو وسعت پیدا ہوتی ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱- اس میں لفظ مَا کو مِنْ کے معنی میں موصولہ مانا جائے اس صورت میں معنی یہ ہوگا، اس ذات کی قسم جس نے جنس مذکر و مونث کو پیدا کیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی قسم اٹھائی ہے۔ ابن مسعودؓ کی قرأت (اَلَّذِیْ خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی) اسی معنی کو واضح کر رہی ہے۔

۲- مَا کو مصدری معنی میں لیا جائے تو مطلب ہوگا، تخلیق مذکر و مونث کی قسم، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی قسم کھائی ہے اور حضرت ابودرداءؓ اور ابن مسعودؓ کی صحیحین والی قرأت سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت ابودرداءؓ نے اس شاذ قرأت کو قرآن میں کیوں نقل کیا؟ تو اس کی وجہ ابن حجرؒ نے یہ بیان کی ہے:

> ممکن ہے یہ قرأت بھی ان قراءات میں سے ہو جن کی تلاوت عرضۂ اخیرہ کے وقت منسوخ کر دی گئی تھی اور ابودرداءؓ کو اس کے منسوخ ہونے کا پتہ نہ چل سکا ہو۔ تعجب ہے کہ حفاظ کوفہ نے اس قرأت کو ابن مسعودؓ اور علقمہؒ سے نقل کیا

ہے اور کوفہ میں قرأت کی سند ان ہی تک پہنچتی ہے لیکن اس کے باوجود حفاظ کوفہ میں سے کسی نے بھی اس کو (وَالذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى) نہیں پڑھا۔ یہی معاملہ اہل شام کا ہے انہوں نے قرأت کا علم ابودرداءؓ سے لیا ہے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس کے مطابق قرأت نہیں کی، لہذا قوی امکان ہے کہ یہ قرأت منسوخ ہوچکی تھی (۳۹)۔

گویا حضرت ابودرداءؓ سے رسم عثمانی کے مخالف اور بہ طریق آحاد نقل ہونے کی وجہ سے یہ قرأت قرآن نہیں ہوسکتی، اگر یہ قرأت ہوتی تو بہ طریق تواتر منقول ہوتی اور رسم عثمانی کے مطابق ہوتی۔

المختصر زیر بحث موضوع پر اگر شریعت اسلامیہ کے اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے کہ کسی بھی لفظ کا قرآن ہونا صرف اسی وقت لازم نہیں آتا جب وہ تواتر اور توارث سے نقل ہوا ہو تو بہت سارے اشکالات خود بخود رفع ہوجاتے ہیں، کیونکہ جو لوگ شرف صحابیت سے مشرف ہوئے انہوں نے آپؐ کو جو کچھ فرماتے سنا یا جو کام کرتے دیکھا ان کے حق میں ان باتوں کا ثبوت یقینی اور قطعی ہے جس میں معمولی شک وشبہہ بھی دائرۂ اسلام سے خارج کردینے کے لیے کافی ہے، البتہ وہ لوگ جن کو رسول اللہؐ سے بلا واسطہ استفادے کا موقع نہیں ملا، ان کے لیے رسول اللہؐ کے کسی قول یا عمل کے ثبوت کی صرف تین ہی صورتیں ہیں: ۱۔ آپؐ کا وہ حکم یا قول تواتر کے ذریعہ پہنچا ہو، یعنی خبر دینے والے اور اس حکم کو روایت کرنے والے لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہونا عقلی طور پر محال ہو۔ جو قول اور فعل بھی اس طریقے سے ثابت ہو اس کا انکار کفر ہے۔ ۲-آپؐ کا حکم اور قول خبر متواتر کی بجائے اخبار آحاد کے ذریعے ثابت ہو، یعنی گواہوں کے کم تعداد میں ہونے کی وجہ سے وہ خبر قطعی الثبوت اور یقینی نہیں ہوتی اور اس میں شک وشبہہ کی گنجائش ہوتی ہے۔ ۳-آپؐ کا وہ قول اور فعل اس طرح کا ہو کہ امت کے تعامل اور توارث کے ذریعے سے اگلی نسل تک منتقل ہوا ہو اور اس میں کسی کو اختلاف کرتے دیکھا اور سنا نہ گیا ہو، یہاں تک کہ یہ سلسلہ حضورؐ پر ختم ہو۔ امت کے توارث اور تعامل سے بھی جو حکم ثابت ہو وہ بھی تواتر ہی کی طرح قطعی اور یقینی ہے اور اس کا انکار بھی کفر کو مستلزم ہے۔ قرآن پورے کا پورا تواتر، تعامل امت اور توارث کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے، اس لیے اس کے ایک حرف کا انکار

بھی کفر ہے، جب کہ مندرجہ بالا سطور میں ہم نے جن روایات کا جائزہ پیش کیا ہے وہ اخبار آحاد ہیں اور اصولاً ان روایات سے کسی لفظ کا قرآن ہونا لازم نہیں آتا اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ ان روایات سے جو مفہوم کشید کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ مبنی بر تکلف اور علمی دیانت کے منافی ہے، جیسا کہ ہم نے تفصیلی دلائل سے واضح کیا ہے۔

حواشی وتعلیقات

(۱)رسول اللہؐ کا فرمان ہے:''لا تصدقوا اهل الكتاب ولا تكذبوهم''(بخاری،کتاب التوحید ، باب ما یجوز من تفسیر التوراة،ح:۷۵۴۲،ص ۱۵۸۴)۔(۲)مستشرق جارج سیل نے ۱۸۶۲ء میں قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر انگریزی زبان میں شائع کی۔سیل عربی زبان کا ماہر سمجھا جاتا ہے،اس نے جو غلطیاں کیں وہ یقیناً قصد اور ارادہ کے ساتھ تھیں،اس نے قرآن مجید کا مقدمہ بھی لکھا اور اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن مجید محمدؐ کی تصنیف ہے اور اس میں بڑی حد تک تحریف ہو چکی ہے۔بعد میں آنے والے مستشرقین نے اسی کی تحقیقات کو بنیاد بنا کر قرآن مجید پر اعتراضات کیے ہیں۔اختلاف قراءات اور ''سبعہ احرف'' کی رائی کو جارج سیل نے کس طرح پہاڑ بنایا ہے،ملاحظہ فرمائیں:

> ''قرآن کے ایڈیشنوں کا ذکر کرنے کے بعد قارئین کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا مناسب نہ ہوگا کہ قرآن کے ابتدائی ایڈیشن سات ہیں:اگر ان کو ایڈیشن کہنا مناسب ہو یا ہم ان کو اس کتاب کی سات نقلیں کہہ سکتے ہیں۔جن میں سے دو مدینہ میں شائع ہوئیں اور وہاں استعمال ہوتی تھیں۔تیسری مکہ میں،چوتھی کوفہ میں،پانچویں بصرہ میں،چھٹی شام میں اور ساتویں نقل کو عام ایڈیشن کہہ سکتے ہیں''۔
> (دی قرآن،ص ۴۵)

اسی طرح مستشرق آرتھر جیفری نے بھی قرآن مجید کی قراءات اور اس کی نوعیّتوں میں صحابہ کرام کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کو بنیاد بنا کر قرآن مجید کے متن میں ارتقاء ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔مستشرق موصوف نے مصحف عثمانی کے مقابل پندرہ بنیادی (Primary Codices) اور تیرہ ثانوی نسخہ جات (Secondary Codices) پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

Arthur Jeffery, "The Koran: Selected Suras", p:20 "Materials for the

history of the text of the Quran" (E.J.Brill, 1937)

بلکہ موصوف نے یہاں تک کہا ہے کہ آپؐ قرآن کی تکمیل سے قبل ہی وفات پاگئے۔

''یہ بات ظاہر ہے کہ محمدؐ اپنی جماعت کے لیے ایک ایسی کتاب کی تیاری میں مصروف تھے جو مسلمانوں کے لیے وہی حیثیت رکھے جو یہودیوں کے لیے عہد نامہ قدیم اور عیسائیوں کے لیے عہد نامہ جدید کی ہے لیکن اس کتاب کی تکمیل سے پہلے وہ فوت ہوگئے اور آج قرآن کی صورت میں جو کچھ موجود ہے، بس اس کے وہ اجزاء ہیں جنہیں ان کے بعد ان کے پیروکار جمع کر سکے اور اسے محمدؐ کے الہامات کے مجموعے کے طور پر جاری کردیا''۔(اسلام،محمد اینڈ ہز ریلیجن،ص ۴۷)

(۳) ابن ماجہ،کتاب الحدود ، باب الرجم ،ح ۲۵۵۳،ص ۳۶۷،''الموطا''کتاب الحدود ، باب ماجاء فی الرجم ،ح ۸۴۶،ص ۵۰۷۔

(۴) حافظ محمد اسلم جیراج پوری (م ۱۹۵۵ء) اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ روایت قرآن کی صریح آیت (اِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ) کے خلاف ہے،اس لیے ہرگز تسلیم کے قابل نہیں ہے،خواہ اس کے راوی جبرائیل ومیکائیل ہی کیوں نہ بتائے جائیں''۔(ہمارے دینی علوم،ص ۴۱)۔

مولانا جعفر شاہ پھلواری (م ۱۹۸۲ء) لکھتے ہیں:

''قطع نظر اس بات کے کہ اس سے قرآن پاک کی محفوظیت کا دعویٰ بے معنی ہوجاتا ہے۔ذرا یہ دیکھیے کہ (اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ) کی زبان ذرہ برابر بھی قرآنی زبان معلوم ہوتی ہے؟ کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حسبنا کتاب اللّٰہ کہنے والے حضرت عمرؓ صحت حدیث میں تو اتنے متشدد ہوں اور حفاظت قرآن کا معاملہ آئے تو اتنے ڈھیلے ثابت ہوں؟''۔(اسلام-دین آسان،ص ۳۴۹،اجتہادی مسائل،ص ۲۶۱)

جناب غلام جیلانی برقؔ (م ۱۹۸۵ء لکھتے ہیں:

''بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ چند آیات پہلے قرآن مجید میں موجود تھیں لیکن بعد میں نکال دی گئیں (موطا کی روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں) اگر پڑھتے رہے تو نکالی کس نے اور اگر نکال دی گئی تھیں تو اللّٰہ کا وعدۂ حفاظت قرآن کیا ہوا''۔(دو اسلام،ص ۱۶۸)

اسی روایت پر مولانا امین احسن اصلاحیؒ (م ۱۹۹۷ء) کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

''یہ روایت بالکل بے ہودہ ہے اور ستم یہ ہے کہ اس کو منسوب حضرت عمرؓ کی طرف کیا گیا ہے، حالانکہ

ان کے عہد مبارک میں اگر کوئی یہ روایت کرنے کی جرأت کرتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان کے درّے سے نہ بچ سکتا‘‘۔(تدبر قرآن، ۵/ ۳۶۷)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے شاگرد جناب جاوید احمد غامدی موطا کی زیر تبصرہ روایت پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’دوسری بات جو بالخصوص موطا امام مالکؒ کی روایت سے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن یہی نہیں جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے بلکہ اس میں سے بعض آیات نکال دی گئی ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ نہایت خطرناک ہے اور جس منافق نے بھی اسے وضع کیا ہے اس کا مقصد صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کو لوگوں کی نگاہوں میں مشتبہ ٹھہرایا جائے اور اہل فتنہ کے لیے راستہ نکالا جائے کہ وہ اس طرح کی بعض دوسری آیات وضع کر کے اپنے عقائد ونظریات بھی اللہ کی اس کتاب میں داخل کرسکیں‘‘۔(برہان، ص ۵۷)

(۵) بخاری، کتاب الحدود، باب الاعتراف بالزنا، ح:۶۸۲۹، ص ۱۴۳۲۔ مسلم، کتاب الحدود باب رجم الثیب فی الزنی، ح:۴۴۱۸، ص ۷۴۹۔ (۶) فتح الباری، کتاب الحدود، باب الاعتراف بالزنا، ۱۲/ ۱۴۳۔ (۷) المسند، حدیث عمر بن الخطابؓ، ح:۱۵۷، ۱/ ۴۰۔ (۸) شرح الزرقانی علی موطا الامام مالک، ۴/ ۱۹۳-۱۹۴۔ (۹) المنہاج، کتاب الحدود، باب رجم الثیب فی الزنا، ۱۱/ ۱۹۱۔ (۱۰) السنن الکبری، کتاب الحدود، باب ما یستدل به علی ان السبیل هو جلد الزانیین، ح:۱۶۹۱۲، ۸/ ۳۶۷۔ المستدرک، کتاب الحدود، ح:۸۲۳۸، ۸۲۳۹، ۵/ ۲۷۸۔ المسند، حدیث عمر بن الخطاب، ح:۱۹۸، ۱/ ۴۹، ایضاً، ح:۳۵۴، ۱/ ۸۱۔ (۱۱) تفسیر الطبری، تفسیر سورۃ المائدہ، آیت:۴۲، ۴/ ۱۵۷۔ (۱۲) السنن الکبری، کتاب الحدود، باب ما یستدل به علی ان السبیل هو جلد الزانیین، ح:۱۶۹۱۳، ۸/ ۳۶۷۔ (۱۳) المستدرک، کتاب الحدود، ح:۸۲۳۸، ۵/ ۲۷۸۔ (۱۴) تورات میں اب بھی ایسی آیات موجود ہیں جو زیر تبصرہ حدیث کے مفہوم پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً: ’’اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں یعنی وہ مرد بھی جس نے اس عورت سے صحبت کی اور وہ عورت بھی‘‘۔(کتاب استثناء، ۲۲:۲۲)۔ اس کی تائید حضرت عیسیٰؑ کی انجیل میں بھی ہے:

’’اور فقیہ اور فریسی ایک عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی اور اسے بیچ میں کھڑا کر کے یسوع سے

کہا: اے استاذ! یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے تورات میں موسیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں''۔(انجیل یوحنا،۸:۳)

(۱۵)النمل:۲۷/۲۸۔(۱۶) آل عمران:۳/۱۴۵۔الانفال:۸/۶۸۔(۱۷)النساء:۴/۱۰۳۔البقرہ: ۲/۱۸۳۔(۱۸)الطّور:۵۲/۲-۳۔(۱۹)بخاری،کتاب الحدود ، باب الاعتراف بالزنا ،ح: ۶۸۲۷،ص۱۴۳۲۔(۲۰)عمدۃ القاری،کتاب الحدود ، باب الاعتراف بالزنا،۱۲/۴۔(۲۱) بخاری،کتاب الحدود ، باب رجم الحبلی فی الزنا،ح:۶۸۳۰،ص۱۴۳۳۔(۲۲)المسند،مسند عبد الله بن مسعودؓ ،ح:۴۱۱۸،۱/۱۵۷۔(۲۳)المسند،مسند عبد الله بن مسعودؓ ،ح: ۳۹۳۵،۱/۱۵۷۔(۲۴)مسلم،کتاب الرضاع ، باب التحریم بخمس رضعات ،ح:۳۵۹۷، ص۶۱۷۔ترمذی کتاب الرضاع ، باب ما جاء لا تحرم المصة والمصتان،ح:۱۱۵۰،ص۲۷۹۔ نسائی،کتاب النکاح، باب القدر الذی یحرم من الرضاعة ،ح:۳۳۰۹،ص۴۵۷۔ابوداؤد کتاب النکاح ، باب هل تحرم ما دون خمس رضعات ،ح:۲۰۶۲،ص۲۹۹۔الموطا،کتاب الرضاع ، باب ما جاء فی الرضاعة،ح:۵۵۰،ص۳۸۷۔(۲۵)المنہاج،کتاب الرضاعة ، باب التحریم بخمس معلومات ،۲۹/۱۰۔(۲۶)الاتقان فی علوم القرآن،۲/ ۶۴۔(۲۷)المنہاج، کتاب الرضاعة ، باب التحریم بخمس معلومات ،۲۹/۱۰۔(۲۸)الاتقان فی علوم القرآن،۲/ ۶۴۔(۲۹)مشکل الآثار،باب بیان مشکل ما روی انه کان انزل عشر رضعات ،۶/۳۔ (۳۰)ایضاً۔(۳۱)مسلم،کتاب الزکوٰۃ باب لو ان لابن آدم وادیین لابتغی ثالثاً ،ح:۲۴۱۹، ص۴۲۲۔(۳۲)ابوریّہ اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

نجتزی بما اوردنا وهو کاف هنا لبیان	ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے،اسی پر اکتفا کرتے ہیں،
کیف تفعل روایة حتی فی الکتاب الاول	ہماری بیان کردہ مثالیں یہ واضح کرنے کے لیے کافی
للمسلمین وهو القرآن الکریم ! ولا ندری	ہیں کہ روایات مسلمانوں کی بنیادی کتاب یعنی قرآن
کیف تذهب هذه الروایات التی تفصح بان	مجید کے بارے میں کیا گل کھلاسکتی ہیں۔ہم نہیں سمجھ
القرآن فیه نقص وتحمل مثل هذه المطاعن	سکے کہ یہ روایات جو صاف صاف کہتی ہیں کہ قرآن
مع قول اللّٰه سبحانه (اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّكرَ	ناقص ہے اور جن میں اس طرح کے مطاعن موجود ہیں

وَاِنَّـا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ) وايهما نصدق ؟ اللّٰهم ان هذا امــر عـجيــب يجب ان يتدبـره اولـوا الالباب ۔　(اضاءعلی السنۃ المحمدیۃ،ص ۲۵۷)۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ساتھ کیسے چل سکتی ہیں کہ: (اِنَّـا نَـحْـنُ نَـزَّلْـنَـا الذِّكْـرَ وَاِنَّـا لَـهٗ لَـحَــافِظُوْنَ) ہم ان میں سے کس بات کو درست تسلیم کریں؟ یا اللہ! یہ بڑا ہی عجیب معاملہ ہے اور لازم ہے کہ اہل عقل اس پر غور کریں۔

(۳۳)مسلم مقدمۃ الکتاب،ص۵۔(۳۴)مسلم،کتــاب الــزکـوٰة بــاب لـو ان لابن آدم وادیین لابتـغی ثالثًا ،ح:۲۴۱۶،ص۴۲۱۔(۳۵)ایضاً،ح:۲۴۱۹،ص۴۲۱۔(۳۶)المسند،حـدیث زِر بن حبیـش عن ابی بن کعب ،ح:۲۰۶۹۸،۶/۱۵۷۔(۳۷)تفسیر القرطبی،تفسیر سورة (لَمْ يَكُنْ) ، ۲۰/۱۳۹۔(۳۸)مسلم،کتـاب فضائل القرآن وما یتعلق به ، باب ما یتعلق بالقراء ا ت ،ح: ۱۹۱۶،ص۳۳۲۔بخاری،کتـاب التـفسیر ، سورة (وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى) ح:۴۹۴۴،ص۱۰۷۲۔
(۳۹)ڈاکٹر غلام جیلانی برق مذکورہ بالا روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”گویا تین جلیل القدر صحابہ نے یہ شہادت دے دی کہ یہ آیات مذکورہ بالا صورت میں نازل ہوئی تھیں لیکن آج قرآن مجید میں یوں درج ہیں:(وَالَّيْـلِ اِذَا يَـغْشٰـى وَالـنَّهَـارِ اِذَا تَـجَلّٰى وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰـــى)اب کس کو صحیح تسلیم کریں؟ان صحابہ کو صحیح مسلم کو یا قرآن شریف کو؟ لازماً یہی ماننا پڑے گا کہ ہمارا قرآن صحیح ہے اور یہ حدیث مشتبہ“۔(دو اسلام،ص۱۷۸)۔

(۴۰)فتح الباری،کتاب التفسیر ، باب (وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى) ،ح:۴۹۴۴،۸/۷۰۷۔

مآخذ ومصادر

کتاب مقدس،شائع کردہ، بائبل سوسائٹی انارکلی، لاہور۔ بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیلؒ (۱۹۲-۲۵۶ھ)۔صحیح بخاری، دارالسلام للنشر والتوزیع الریاض، ۱۹۹۷ء۔ ابن ماجہ،محمد بن یزید (۲۰۹- ۲۷۳ھ)۔سنن ابن ماجہ، دارالسلام للنشر والتوزیع الریاض، ۱۹۹۹ء۔ ابو داؤد، سلیمان بن اشعث بن اسحاق الازدی السجستانی، (۲۰۲-۲۷۵ھ)،سنن ابی داؤد،دارالسلام للنشر والتوزیع الریاض،۱۹۹۹ء۔ مالک بن انس، الامام،(م۱۷۹ھ)،الموطا،دار احیاء التراث العربی بیروت،۱۹۹۸ء۔مسلم بن حجاج بن مسلم القشیر ی،الامام ابوالحسین (۲۰۴-۲۶۱ھ)،صحیح مسلم،

دارالسلام للنشر والتوزیع الریاض، ۱۹۹۸ء۔ النسائی، احمد بن شعیب بن علی بن سنان، ابوعبدالرحمان (۲۱۵-۳۰۳ھ)، سنن النسائی، دارالسلام للنشر والتوزیع الریاض، ۱۹۹۹ء۔ احمد بن حنبل، ابوعبداللہ الشیبانی (۱۶۴-۲۴۱ھ)، المسند، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۹۹۱ء، مجلدات: ۷۔ الحاکم، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ (م ۴۰۵ھ)، المستدرک علی الصحیحین (دارالفکر بیروت، ۲۰۰۱ء) مجلدات: ۵۔ البیہقی، ابوبکر احمد بن الحسین ابن علی (م ۴۸۵ھ)، السنن الکبری (دار الکتب العلمیۃ بیروت، ۱۹۹۹ء) مجلدات: ۱۱۔ الطحاوی، ابوجعفر احمد بن محمد، امام (۲۳۹-۳۲۱ھ)، شرح معانی الآثار، المکتبۃ الامدادیۃ، ملتان۔ ابن حجر العسقلانی، احمد بن علی (۷۷۳-۸۵۲ھ)، فتح الباری، موسسۃ مناہل العرفان، بیروت، مجلدات: ۱۳۔ العینی، بدرالدین، علامہ (م ۸۵۵ھ)، عمدۃ القاری، دارالفکر بیروت، مجلدات: ۱۲۔ الزرقانی، محمد بن عبدالباقی بن یوسف (م ۱۱۲۲ھ)، شرح الزرقانی علی موطا لامام مالک، (داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۹۹۷ء) مجلدات: ۴۔ النووی، یحییٰ بن شرف النووی (م ۶۷۶ھ)، المنہاج (موسسۃ مناہل العرفان بیروت) مجلدات: ۹۔ ابن جریر الطبری، امام ابوجعفر محمد، (م ۳۱۰ھ) تفسیر الطبری (دارالفکر بیروت، ۱۹۷۸ء) مجلدات: ۱۰۔ القرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد (م ۶۷۱ھ)، تفسیر القرطبی (موسسۃ مناہل العرفان بیروت) مجلدات: ۱۰۔ سیوطی، جلال الدین، علامہ (م ۹۱۱ھ)، الاتقان فی علوم القرآن (نور محمد اصح المطابع، کراچی)۔ ابوریہ، محمود، اضواء علی السنۃ المحمدیۃ (دارالمعارف، مصر)۔ جیراج پوری، حافظ اسلم (م ۱۹۵۵ء)، ہمارے دینی علوم (دوست ایسوسی ایٹس، اردو بازار، لاہور)۔ پھلواری، جعفر شاہ (م ۱۹۸۲ء)، اسلام...... دین آسان (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۵ء)، اجتہادی مسائل (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۹ء)۔ برق، غلام جیلانی (م ۱۹۸۵ء)، دو اسلام (اتحاد پریس، لاہور، کیمل پور سے شائع ہوئی، ۱۹۵۰ء)۔ اصلاحی، امین احسن (م ۱۹۹۷ء)، تدبر قرآن (تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۹۷ء) مجلدات: ۹۔ غامدی، جاوید احمد، برہان (دارالاشراق، ۱۲۳ بی ماڈل ٹاؤن، لاہور، ۲۰۰۱ء)۔

George Sale, "The Koran", P:45 (London, 1812 AD)

Arthur Jeffery, "The Koran: Selected Suras" (New Yark Herteg Press, 1958), P:20 (Leiden), "Materials for the history of the text of the Quran" (E.J.Brill, 1937), "Islam, Muhammad and his religion", P:47 (Indiana, 1979).

فلسفۂ تعلیم اسلامی تناظر میں

ڈاکٹر خواجہ محمد سعید

فلسفہ، مذہب اور سائنس کی تمام تر تحقیق کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ حقیقت مطلقہ کیا ہے اگرچہ ان کی تحقیق کا طریق کار اپنا اپنا ہے۔ ہر انسان کے ذہن میں چند بنیادی سوالات پیدا ہوتے ہیں کیونکہ اس کی فطرت میں جستجو ہے یہی جستجو زندگی ہے اس کا تعلق اس دنیا تک محدود نہیں بلکہ یہ جستجو اگلی دنیا میں بھی جاری وساری رہے گی، جنتی بہتر سے بہتر کی جستجو کریں گے، دوزخی دوزخ سے نکل جانے کی جستجو کریں گے۔ تین بنیادی سوالات ہیں جن کے گرد انسان کی دنیاوی زندگی گردش کررہی ہے۔ انسان سوچتا ہے میں کون ہوں، کدھر سے آیا ہوں، زندگی کا مقصد کیا ہے؟ جب وہ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ایک اہم سوال اس کے ذہن میں جنم لیتا ہے کہ حقیقت مطلقہ کیا ہے؟ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کے لیے انسان کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے علم۔ تمام انبیاء علیہ السلام نے انسانوں کی تعلیم کے ذریعے ہی رہنمائی فرمائی۔ علم حاصل کرنے کے مختلف ذرائع ہیں۔ فلسفہ تعلیم میں علم کو بنیادی حیثیت دی جاتی ہے اس حوالے سے اصل سوال یہ ہے کہ علم کا ماخذ یا سرچشمہ کیا ہے؟ علم کہاں سے آتا ہے اور کیسے آتا ہے؟ اس کا سب سے زیادہ مستند ذریعہ کیا ہے کیا انسانی عقل یا انسانی ذہن کو علم کا سرچشمہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلہ میں ہم پہلے ذرائع علم کے بارے میں بحث کریں گے۔

حواس خمسہ: قرآن پاک نے سب سے پہلے حواس خمسہ کو ذریعہ علم قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

شعبۂ فلسفہ، جامعہ پنجاب، لاہور۔

وَهُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَ لَکُمُ السَّمْعَ	اور وہی تو ہے جس نے تمہارے کان اور آنکھیں
وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ قَلِیْلًا مَّا	اور دل بنائے لیکن تم کم شکر گزاری کرتے ہو۔
تَشْکُرُوْنَ (۱)	

اسی طرح اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں حواس کو ذریعہ علم قرار دیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی تدبر اور تفکر پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حواس علم کا ذریعہ ضرور ہیں مگر بعض اوقات یہ ہمیں دھوکہ دیتے ہیں۔ مثلاً ایک سیدھی چھڑی کو پانی میں ڈبو کر دیکھیں تو وہ ٹیڑھی نظر آئے گی جب اسی چھڑی کو پانی سے باہر نکال کر دیکھیں تو سیدھی نظر آئے گی۔ بخار کی حالت میں ایک شخص کو چینی بھی کڑوی لگتی ہے جب کہ چینی میٹھی ہے۔ اسی طرح دھوپ میں ریت کے چمکتے ہوئے ذرے پانی نظر آتے ہیں۔ حواس ذریعہ علم ضرور ہیں مگر ہم ان کو قطعی مستند ذریعہ علم نہیں کہہ سکتے۔

عقلی علم: قرآن پاک نے عقل کو بھی ذریعہ علم کے طور پر مانا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَهُوَ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ	جو بات کو سنتے اور اچھی طرح پیروی کرتے
اَحْسَنَهٗ اُوْلٰٓئِکَ الَّذِیْ هَدٰهُمُ اللّٰهُ	ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے ہدایت
وَاُوْلٰٓئِکَ هُمْ اُوْلُوا الْاَلْبَابَ (۲)	دی اور یہی لوگ عقل رکھتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے یہ وسیع کائنات تخلیق فرمائی جو معلومات کا ذریعہ ہے۔ معلومات کو حاصل کرنے کے لیے انسان کو باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ اور ذائقہ جیسی پانچ قوتوں سے بھی نوازا۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ان قوتوں کا تعلق انسان کے جسم کے ساتھ ہے اسی طرح روح کی بھی پانچ قوتیں ہیں جن سے علم حاصل ہوتا ہے ان میں ایک قوت متخیلہ جو تصور کے ذریعے اشیاء کو خیال میں لاتی ہے اور اس سے نتیجہ برآمد کرتی ہے دوسری قوت متفکرہ جو تمام امور پر غور کر کے ان کی باریکیوں کی جانچ پڑتال کرتی ہے۔ تیسری قوت مدرکہ جو اشیاء کے حقائق کا ادراک کرتی ہے۔ چوتھی قوت حافظہ یہ ایسی قوت ہے جو انسان کے خیال، سوچ اور سمجھ کو یاد رکھتی ہے اور پانچویں قوت حس ہے، یہ قوت جسم اور روح میں مشترک ہے۔ ذہن کے ذریعے علم روح تک پہنچتا ہے اور روح اپنی قوتوں کو عمل میں لاتی ہے اور اپنے جسم کے درمیان مشترک

قوت کے ذریعے اس علم کو دماغ تک منتقل کرتی ہے جس سے دماغ میں تحریک پیدا ہوتی ہے اور دماغ اپنے ایک مخصوص نظام کے تحت اس تحریک کو جسم میں منتقل کرتا ہے جس کا اظہار ہمارے جسم کے مختلف اعضاء سے ہوتا ہے۔قوت حس نہ صرف روح کے پیغامات کو جسم تک لے کر جاتی ہے بلکہ یہ ظاہری قوتوں سے حاصل ہونے والے علم کو بھی روح تک لے کر جاتی ہے۔مثلاً جب ہماری نظر پھول پر پڑتی ہے یہ ظاہری قوت یعنی قوت باصرہ ہمارے اندر ایک احساس پیدا کرتی ہے اس احساس کو قوت حس باطنی قوتوں تک لے جاتی ہے۔یعنی حس مشترک اس مشاہدے کو قوت خیال کے سامنے پیش کرتی ہے۔قوت خیال اس پر تخیل وتصور کر کے اس کو قوت متفکرہ تک پہنچاتی ہے۔ یہ قوت اس پر غور کر کے اس کو قوت مدرکہ کو منتقل کر دیتی ہے جو اس کی حفاظت کرتی ہے اور اس کو قوت حافظہ میں محفوظ کر دیتی ہے۔یوں روح اور جسم ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

انسان حواس خمسہ کے ساتھ مشاہدہ وتجربہ کے ذریعہ اس وسیع کائنات سے علم حاصل کرتا ہے اور عقل وخرد کے ذریعے زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کرتا ہے۔قرآن پاک نے بھی کائنات کے اسرار ورموز کو سمجھنے پر زور دیا ہے قرآن پاک میں ۷۵٦ آیات ایسی ہیں جن میں مظاہر فطرت کے مطالعے پر زور دیا گیا ہے۔اس طرح انسان میں تفکر وتدبر اور تجسس وتعقل کی صلاحیت پروان چڑھتی ہے۔ارشاد ربانی ہے کہ:

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمَاوَاتِ وَالۡاَرۡضِ
وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ
الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ
النَّاسُ وَمَا اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ
مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ
مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ
وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیَاحِ وَالسَّحَابِ
الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ
لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (۳)

بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں اور کشتیوں اور جہازوں میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر رواں ہیں اور مینہ میں جس کو اللہ آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ یعنی خشک ہوئے پیچھے سرسبز کر دیتا ہے اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے

درمیان گھرے رہتے ہیں عقل مندوں کے لیے
اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔

عقلی علم دلیل کی بنیاد پر ہے اس میں مشاہدہ کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا اس کی عام مثالیں منطق اور ریاضی کا علم ہے۔ اس کی سچائی کا معیار مجرد منطق کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ مثلاً ایک ہی شئی میں دو متناقض صفات ایک ہی وقت میں اور ایک ہی مفہوم میں نہیں ہوسکتیں۔ ایک شخص ایک ہی وقت میں مسلم اور غیر مسلم نہیں ہوسکتا۔ ایک ہی طالب علم ایک ہی وقت میں لائق اور نالائق نہیں ہوسکتا۔ ایک ہی پھول ایک ہی وقت میں سرخ اور غیر سرخ نہیں ہوسکتا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک پھول آج سرخ ہے اور کل سرخ نہ رہے لیکن ایک ہی وقت میں سرخ اور غیر سرخ ہونا محال ہے۔ قرآن پاک نے بھی دلیل کے انداز کو اپنایا ہے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت نے دلیل پیش کردی۔ ارشاد ربانی ہے:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ (۴)	یہ کتاب قرآن مجید اس میں کچھ شک نہیں کہ کلام اللہ ہے، اللہ سے ڈرنے والوں کی رہنما ہے۔

اسی طرح قرآن پاک نے کفار کو چیلنج کرتے ہوئے اپنے بارے میں ایک بڑی دلیل پیش کی۔ ارشاد ربانی ہے:

وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَ کُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۵)	اور اگر تم کو اس کتاب میں جو ہم نے اپنے بندے محمد عربی پر نازل فرمائی ہے کچھ شک ہوتو اسی طرح کی ایک سورت تم بھی بنالاؤ اور اللہ کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں ان کو بھی بلالو اگر تم سچے ہو۔

لیکن عقلی علم بھی حواس خمسہ کی طرح خامیوں سے مبرا نہیں۔ یہ بنیادی طور پر مجرد اور روایتی ہے، یہ منطقی رشتوں اور غیر شخصی معانی پر مبنی ہے۔ اس کا جذباتی ضرورتوں اور اصل صورت حال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہم جذبات کو انسان سے الگ نہیں کرسکتے اس لیے عقلی علم ہی کافی نہیں ہوتا اس کے ساتھ ہمیں وجدانی اور تجربی علم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

تجربی علم: موجودہ دور میں تجربی علم کو خاصی اہمیت حاصل ہے، یہ ایسا علم ہے جس کی بنیاد مشاہدے اور محسوساتی حقائق پر ہے جس موقع پر عقلیت پسند یہ کہتے ہیں کہ دیکھیں اور سوچیں ،تجربیت پسند کہتے ہیں کہ مشاہدہ کریں اور دیکھیں۔اس علم کی مثال موجودہ سائنس ہے۔سائنس مفروضات قائم کرتی ہے پھر ان مفروضوں کو تجربات کے ذریعے پرکھا جاتا ہے کسی بھی مفروضے کو حتمی طور پر ثابت یا مسترد نہیں کیا جا سکتا۔سائنس اپنے مفروضات کے بارے میں دو طرح کے اصول اپناتی ہے ان میں ایک اصول تصدیق پذیری اور دوسرا اصول تکذیب پذیری کا ہے۔پوپر نے درست کہا کہ کسی سائنسی نظریے کو ایک محدود مواد کے ذریعے صحیح ثابت کرنا مشکل ہے البتہ اسے غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔سائنس میں نظریات بدلتے رہتے ہیں لیکن اصل رہنمائی کے لیے انسان کو قرآن پاک کی طرف ہی رجوع کرنا پڑتا ہے۔قرآن پاک نے بھی تجربے اور تحقیق پر زور دیا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

وَالَّـذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا (۶)	اور جب ان کو پروردگار کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو ان پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے بلکہ غور و فکر سے سنتے ہیں۔

اسی طرح فرمایا کہ:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۷)	پھر اس کو بدکاری سے بچنے اور پرہیز گاری کرنے کی سمجھ دی۔

اب انسان کا کام ہے کہ وہ تحقیق کرے کہ اس کے لیے کون سا راستہ بہتر ہے۔یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے پاس علم ہوگا۔

مستند علم: علم کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس کو ہم اس لیے قبول کر لیتے ہیں کہ یہ ہمارے تک ماہر اساتذہ کے ذریعے سے پہنچتا ہے۔یا پھر ہم بغیر کوئی سوال یا اعتراض کیے یہ مان لیتے ہیں کہ اسلام آباد پاکستان کا دارالخلافہ ہے یا روشنی کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ ہے۔ان حقائق کی جانچ پڑتال کی ضرورت اس طرح نہیں ہوتی جس طرح ہم لوگرتھم کے جدول کی جانچ پڑتال کرتے ہیں۔

بعض اوقات ہم کسی علم کو بغیر ثبوت کے مانتے ہیں اس کا انحصار ہماری ذاتی ضرورت اور دل چسپی پر ہوتا ہے۔ اگر ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ نیوٹن کے قوانین حرکت کیا ہیں تو ہم انسائیکلو پیڈیا دیکھیں گے۔ لیکن نیوٹن کے قوانین حرکت کی تفہیم چاہتے ہیں تو پھر ہمیں یہ قوانین خود معلوم کرنا ہوں گے۔ یہ قوانین اسی وقت ہماری سمجھ میں آسکتے ہیں جب ہمیں اس دلیل کا علم ہوگا جس کی بناء پر یہ تشکیل دیے گئے ہیں۔ ان قوانین کی تصدیق سائنسی طریقہ کار سے کی گئی ہے۔ یہ ایک تجربی علم ہے۔ مستند علم علمیاتی سے زیادہ نفسیاتی نوعیت کا ہے۔ اس کے بارے میں ہمارے پاس جو بھی سند ہو وہ ان چیزوں کی ماہیت کے بارے میں ہمارے علم میں کوئی اضافہ نہیں کرتی جو ہم خود جانتے ہیں۔

وجدانی علم: یہ علم کا ذریعہ ہے جو ایک انسان خود کسی خاص لمحے میں وجدان کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ اس کے پیچھے ایک لمبی لاشعوری کوشش کا دخل ہوتا ہے۔ اس میں ایک لمحہ میں ایک ایسے مسئلے کا جو کئی سالوں سے ہمارے ذہن میں ہوتا ہے حل نکل آتا ہے لیکن وجدانی علم اور وجدان کے عمل میں فرق کرنا ضروری ہے۔ فلسفیانہ دعویٰ، سائنسی نظریات اور فن کے نمونے کسی نہ کسی وجدانی کیفیت سے تخلیق ہوتے ہیں۔ ہر انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وجدانی علم کیا ہے؟ یہ وہ علم ہے جو تخیل بصیرت یا پیش کرنے والے کے ذاتی تجربے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً غالب، اقبال اور دوسرے شعراء ہمیں انسان کے قلب کی سچائیوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ ہم خود ان سچائیوں کے بارے میں کسی جائزے یا معیاری آزمائشوں کے ذریعے جانچ کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان کو کسی مفروضے کے ذریعے نہیں پرکھا جاسکتا یہ بصیرت کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ صوفیانہ تحریریں اور شاعرانہ تخیلات وجدانی علم کی عکاسی کرتی ہیں۔

الہامی علم: یہ ایسا علم ہے جو اللہ رب العزت نے انسان پر ظاہر کیا۔ اللہ رب العزت نے کچھ انسانوں میں اس بات کا احساس پیدا کیا کہ وہ سچائی کا درس دیں اور سچائی کو ضبط تحریر میں لائیں تاکہ یہ سچائیاں عام انسانوں تک پہنچ سکیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے یہ سچائی اللہ کے کلام بائبل میں، ہندوؤں کے لیے بھگوت گیتا میں اور مسلمانوں کے لیے قرآن پاک میں ہیں۔ قرآن اللہ کا کلام سچا اور برحق ہے اس لیے ہمیشہ رہے گا۔ سچائیوں کا تمام ریکارڈ اس میں موجود ہے البتہ یہ

ریکارڈ فوق الفطرت ہے لیکن جس زبان میں لکھا گیا ہے وہ عین فطرت ہے۔یعنی یہ مابعد الطبیعیاتی بھی ہے۔انسان کا اپنا وجود بھی طبیعیاتی کے ساتھ مابعد الطبیعیاتی ہے کیونکہ انسان جسم کے ساتھ روح بھی رکھتا ہے اس طرح یہ کلام عین انسان کی فطرت کے مطابق ہے۔اس کے بارے میں ایک سوال ذہن میں پیدا ہوسکتا ہے کہ اس کا ماخذ کیا ہے؟ اسلامی فلسفہ تعلیم کے مطابق اس علم کا سرچشمہ اللہ رب العزت کی ذات ہے جس نے وحی کے ذریعے یہ علم انبیاء کے ذریعے انسان تک پہنچایا۔ارشاد ربانی ہے:

ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡبَـآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡـهِ اِلَیۡکَ وَمَا كُنۡتَ لَدَیۡهِمۡ اِذۡ جَمَعُوۡا اَمۡرَهُمۡ وَهُمۡ یَمۡكُرُوۡنَ (۸)

اے پیغمبر یہ اخبار غیب میں سے ہے جو ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں اور جب برادران یوسف نے اپنی بات پر اتفاق کیا تھا اور وہ فریب کر رہے تھے تو تم ان کے پاس تو نہ تھے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلاَّ وَحۡیًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوۡ یُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَیُوۡحِیَ بِاِذۡنِهٖ مَا یَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَکِیۡمٌ (۹)

اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے مگر الہام کے ذریعے سے پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج دے تو وہ اللہ کے حکم سے جو اللہ چاہے القا کرے بیشک وہ عالی رتبہ اور حکمت والا ہے۔

اب جو سوال ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ وحی سے حاصل شدہ علم معتبر اور مستند ہے کہ نہیں؟ جواب سے قبل فلسفہ کی دو تحریکوں کا ذکر ضروری ہے جن کا تعلق علم سے ہے ان میں سے ایک عقلیت پسندی کی تحریک ہے جس کے مطابق علم انسان کی عقل میں ودیعت کر دیا گیا ہے جب کہ تجربیت پسندی کے نزدیک انسانی ذہن سادہ سلیٹ کی مانند ہے جس پر کچھ بھی لکھا جاسکتا ہے یعنی انسان تجربات سے علم حاصل کرتا ہے۔جہاں تک جدید فکر اور اس کے علم برداروں کا تعلق ہے انہوں نے وحی کو ذریعۂ علم ماننے سے صاف انکار کر دیا ہے۔وہ حواس خمسہ اور عقل اور تجربے کے علاوہ کسی اور برتر ذریعۂ علم کو ماننے کے لیے تیار ہی نہیں۔ان کا کہنا ہے کہ تاریکی کا وہ دور گزر چکا جب الہام و وحی کی باتوں کو بغیر کسی ثبوت کے مانا جاتا تھا۔ان لوگوں میں بعض سلام

کے ماننے والے بھی شامل ہیں۔ نیاز فتح پوری نے کہا تھا کہ:

''اب زمانہ یومنون بالغیب کا نہیں بلکہ یومنون بالتجربہ والشھود کا ہے''۔(۱۰)

اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فکر جدید نے وحی و الہام، اللہ اور آخرت اور اس طرح کے مابعد الطبیعیاتی تصورات کو کس طرح مسترد کر دیا ہے۔ یہاں آگسٹ کامٹے کے تجربہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس نے فکر انسانی کے ارتقاء کے حوالے سے لکھا ہے۔ اس نے فکر انسانی کے ارتقاء کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے:

''پہلے دور میں کائنات کی تشریح الہام اور خداؤں کے حوالے سے کی جاتی ہے، دوسرے دور میں مابعد الطبیعیاتی اسٹیج Metaphysical Stage آجاتی ہے، یعنی کائنات کی ترتیب و تنظیم غیر مرئی طاقتوں کی مرہون منت ہو جاتی ہے اور تیسرے دور میں منطق و استدلال آجاتا ہے اس دور میں فکر انسانی کا ارتقاء ہوتا ہے سائنس آگے بڑھتی ہے، فکر و استدلال کی دنیا وجود میں آتی ہے جس میں کائنات کی تشریح و تعبیر حقائق کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ اب انسانی فکر اس تیسرے دور یعنی عقلی استدلال اور منطقی ثبوتیت کے دور سے گزر رہی ہے جسے فلسفہ کی زبان میں منطقی اثباتیت Logical Postivism کہا جاتا ہے''۔(۱۱)

سائنس نے کچھ حیران کن انکشافات کیے ہیں کل تک جو غیب تھا آج وہ حاضر ہے لیکن پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا سائنس نے کائنات کے تمام راز فاش کر دیے ہیں یا ابھی بہت کچھ باقی ہے اس میں کوئی شک نہیں سائنس جوں جوں ترقی کرتی جائے گی نئے انکشافات اور حقائق سامنے آتے رہیں گے لیکن سائنس ابھی تک اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکی کہ اس نے حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے بلکہ کبھی کبھی سائنس اپنی ہی بات کی تردید کر دیتی ہے یعنی ابھی اسے اپنے کہے ہوئے پر اعتماد نہیں۔

قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے:

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا اور آسمانوں کو ہم نے ہاتھوں سے بنایا اور اللہ

لَمُوْسِعُوْنَ (۱۲) — اسے وسعت دے رہا ہے۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآئَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۱۳) — بلکہ ہم ان لوگوں کو اور ان کے باپ دادا کو متمتع کرتے رہے یہاں تک کہ اسی حالت میں ان کی عمریں بسر ہو گئی کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں تو یہ لوگ غلبہ پانے والے ہیں۔

اللہ رب العزت کی بنائی ہوئی کائنات اس قدر وسیع ہے کہ اس کا اندازہ انسان کے لیے آسان نہیں۔ جہاں تک ہماری عقل کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود حواس خمسہ کی مرہون منت ہے جو بذات خود ناقص اور کمزور ہیں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

اب ہمارے سامنے معاملہ وحی کا ہے۔ وحی کی بطور ذریعہ علم وضاحت سے پہلے وحی کے لفظی معنی پر غور کرنا ضروری ہے۔ ''وحی کے لغوی معنی خفیہ اور لطیف اشارہ کے ہیں جس کو صرف اشارہ کرنے والا اور اشارہ پانے والا محسوس کر سکتا ہے''۔ (۱۴) اسی طرح لسان العرب میں ہے کہ:

واصل الوحی فی اللغة کلها اعلام فی خفاء (۱۵) — یعنی لغت کے تمام استعمالات میں وحی کے لفظی معنی خفیہ طور پر آگاہ کرنے کے ہیں۔

انگریزی زبان میں وحی کے لیے Reveal کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی انگریزی میں یوں ہیں:

Allow to appear make know by inspiration or supernatural means.

وحی کے ان لغوی معنی پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وحی کا ذریعہ نہ تو مادی ہے اور نہ اس میں انسان کے اپنے دماغ کا کوئی عمل دخل ہے۔ یہ انسان کی اپنی قوتوں اور مادی کائنات سے ماوراء ہے۔ اپنے لغوی معنی میں یہ جمادات، نباتات، حیوانات، ملائکہ اور انسان پر نازل ہوتی ہے۔ اس کی ایک خاص قسم جو انبیاء پر نازل ہوتی ہے وہ انسانی زندگی کے بنیادی سوالات کا جواب مہیا کرتی ہے، یہ انسان کو اس کے وجود سے آگاہ کرتی ہے۔ وحی ہی واحد ذریعہ ہے جو کائنات اور انسان کے بارے میں حقیقتوں سے آگاہ کرتی ہے۔ خالق کائنات

کی بات ہو یا کائنات کی، کائنات کا مقصد وجود ہو یا انسان کا وجود، تخلیق کی بات ہو یا انسان کے مرتبے کی، خالق کائنات اور بندے کے درمیان تعلق کی بات ہو، دنیا کی بات ہو یا اخروی زندگی کی بات وحی ان تمام بنیادی سوالات کا جواب مہیا کرتی ہے جن کے بارے میں حواس، عقل، تجربہ اور وجدان قاصر ہیں۔ ہماری عقل کی رسائی زماں و مکاں تک محدود ہے لیکن وحی زمان و مکاں کی حدود سے آگے نکل کر بات کرتی ہے، یہ کائنات کے پیچھے چھپے ہوئے راز کا بھی پتہ دیتی ہے۔ یہ کثافت اور لطافت کے درمیان ایک ربط ہے، لطافت اپنا اظہار کثافت میں وحی کے ذریعے ہی کرتی ہے۔ وحی ان تمام نقائص سے پاک ہے جو ادراک حسی و عقلی اور وجدان والہام میں پائے جاتے ہیں۔ یہ حواس کی طرح مادی دنیا کی مرہون منت نہیں، عقل کی طرح خیالی گھوڑے نہیں دوڑاتی اور نہ ہی وجدان کی طرح تجربہ اور مشاہدہ کی مرہون منت ہے۔ یہ مستند اور معتبر ذریعہ علم ہے یہی وہ علم ہے جس پر زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے یہی فلسفہ تعلیم وفلسفہ زندگی کی پائدار بنیاد ہے، یہی زندگی میں توازن اور اعتدال پیدا کرتی ہے۔ یہی انسان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاتی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ رب العزت فرماتا ہے:

قَدۡ جَآءَ كُمۡ مِنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيۡنٌ يَهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ (۲۴)	بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور روشن کتاب آچکی ہے۔ جس سے اللہ اپنی رضا پر چلنے والوں کو نجات کے راستے دکھاتا ہے اور اپنے حکم سے اندھیرے میں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور ان کو سیدھے راستے پر چلاتا ہے۔

اسلام کے نزدیک علم کے سرچشمے دو ہی ہیں ایک تو خود اللہ رب العزت کی ذات ہے جس نے آدم علیہ السلام کو اسمائے گرامی سکھائے (وَعَلَّمَ آدَمَ الۡاَسۡمَآءَ) یہ ایسا سرچشمہ ہے جس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرا سرچشمہ اللہ رب العزت کی تخلیق کی ہوئی کائنات ہے یعنی آفاق والنفس۔ اس کا بنیادی ماخذ بھی وحی ہی ہے۔ اللہ رب العزت نے انسان کو عقل اور حواس سے نوازا ہے جب وہ اس کائنات کے اسرار ورموز پر غور کرتا ہے تو اس سے اس کے عقل اور دماغ

کے بند دریچے کھلتے ہیں۔ اسلام نے بیان کردہ تمام ذرائع علم کی اہمیت کو اپنی اپنی جگہ اجاگر کیا ہے۔ اسلام نہ حواس کو کلیۃً رد کرتا ہے اور نہ ہی عقل و وجدان کو بلکہ ہر ذریعہ علم سے استفادہ کرنے کی تلقین کی ہے، قرآن پاک بار بار انفس و آفاق پر غور کرنے، مشاہدہ کرنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ	کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب جوارح سے
اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلاً (۲۵)	ضرور باز پرس ہوگی۔

اس آیت میں علم کے تین ذرائع کا ذکر ملتا ہے جن میں سمع، بصر اور فواد شامل ہیں ان سے مراد محض سننا، دیکھنا اور فواد ہی نہیں بلکہ سمع سے مراد انسان کے پاس جتنی بھی معلومات ہیں اس سے پوری طرح استفادہ کرنا اور بصر سے مراد خود مشاہدہ کرکے کائنات کے اسرار و رموز کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا اور فواد سے مراد ان دونوں ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں اپنا ایک نتیجہ اخذ کرنا ہے۔ اس طرح قرآن پاک نے حواس کے ذریعے علم حاصل کرنے کی بھی تلقین کی ہے، ارشاد ربانی ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمَاوَاتِ	اور آسمان اور زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں
وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ	جن پر یہ گزرتے ہیں اور ان سے اعراض
عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (۲۶)	کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی تعقل کو استعمال میں لانے کی بھی تلقین کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ	کیا یہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں ان کے
لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا اَوْ اٰذَانٌ	دل ہیں لیکن ان سے سوچتے نہیں اور ان کے کان
يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ	ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ تو آنکھو ہے بصارت
وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ (۲۷)	نہیں بلکہ ان کے دل ہی اندھے ہوگئے ہیں۔

قرآن پاک نے عقل و خرد سے کام نہ لینے کو اندھی تقلید سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا	اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو کتاب
اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ	اللہ نے نازل فرمائی ہے اس کی پیروی کرو تو

اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآئَنَا اَوَ لَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡئًا وَّلاَ يَهۡتَدُوۡنَ (۲۰)

کہتے ہیں نہیں بلکہ ہم اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور یہ نہ سیدھے رستے پر ہوں تب بھی وہ ان ہی کی تقلید کیے جائیں گے۔

ان آیات میں مادی و عقلی ذرائع علم کو بروئے کار لانے کی واضح ہدایت موجود ہے۔ انسان کے حواس کو کائنات اور خود نفس انسانی کے اندر موجود اللہ کی نشانیوں کی طرف توجہ دینے اور ان کا ادراک حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ زمین کو وحی (الہام) ہونے کا بھی قرآن پاک میں ثبوت ملتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

يَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰى لَهَا (۲۱)

اس روز وہ اپنے حالات بیان کردے گی کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کو حکم بھیجا ہوگا۔

اسی طرح ذی حیات میں شہد کی مکھی کی طرف وحی کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَاَوۡحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِىۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعۡرِشُوۡنَ ثُمَّ كُلِىۡ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسۡلُكِىۡ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخۡرُجُ مِنۡۢ بُطُوۡنِهَا شَرَابٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ فِيۡهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ (۲۲)

اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور اونچی اونچی چھتریوں میں جو لوگ بناتے ہیں گھر بنا اور ہر قسم کے میوے کھا اور اپنے پروردگار کے صاف رستوں پر چلی جا۔ اس کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اس میں لوگوں کے کئی امراض کی شفا ہے، بیشک سوچنے والوں کے لیے اس میں بھی نشانی ہے۔

فلسفہ میں ایک بڑی بحث اس بارے میں بھی ہے کہ بعض فلاسفہ عقل اور وحی کو ایک شئے کے دو رخ سمجھتے ہیں لیکن عقل انسانی محدود ہے اس کا یہ وظیفہ نہیں کہ وہ وحی سے حاصل شدہ معلومات کے بارے میں صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں کوئی فتویٰ جاری کرسکے۔ بلکہ اسے خود

وحی کی پیش کردہ معلومات کی روشنی میں اپنی راہ متعین کرنی ہوتی ہے۔ بچہ خود والدین پر انحصار کرتا ہے وہ والدین کو کیا مشورہ دے سکتا ہے۔ وحی کے بغیر عقل اندھی ہوتی ہے۔ جس طرح آنکھ اندھیرے میں کسی شئے کو نہیں دیکھ سکتی اسی طرح وحی کے بغیر عقل حقیقت کو نہیں پہچان سکتی۔ معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان اس مسئلہ پر واضح اختلاف تھا۔ معتزلہ کا خیال تھا کہ صداقت کا اصل معیار عقل ہے لہذا ہر وہ نظریہ جو عقل کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا وہ باطل ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن پاک کی آیات کے بارے میں یہ معیار مقرر کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں کوئی بات خلاف عقل نہیں اگر کوئی ایسی بات بظاہر نظر بھی آتی ہے تو ہماری اپنی سمجھ کا قصور ہے۔ اس کے برعکس روایت پسند علماء کا خیال تھا کہ انسانی عقل مذہب کے اسرار و رموز سمجھنے سے قاصر ہے۔ ان کا خیال تھا کہ وحی مافوق العقل ذریعہ علم ہے جس کو ہر اعتبار سے فوقیت حاصل ہے۔ اشاعرہ نے ان دونوں کے درمیان سے ایک نئی راہ نکالی۔ ان کا خیال تھا کہ عقل پر وحی کو فوقیت حاصل ہے مگر عقل کے اپنے مقام سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی ایسی بات سامنے آئے جہاں عقل اور وحی میں کوئی تناقض نظر آئے تو وہاں عقل کے بجائے وحی کو فوقیت دی جائے۔

وحی الٰہی کو باقی تمام ذرائع پر فوقیت حاصل ہے۔ وحی کی حیثیت امام کی ہے جب کہ دوسرے ذرائع علم کی مقتدی کی ہے۔ مقتدی کو ہر حالت میں امام کی تقلید کرنی پڑتی ہے۔ قرآن پاک نے ایسے لوگوں کے بارے میں بڑے زوردار الفاظ استعمال کیے ہیں جو عقل و خرد اور سمع و بصر کی قوتیں رکھنے کے باوجود وحی الٰہی کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہیں۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (۲۳)	کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر نہیں کی تا کہ ان کے دل ایسے ہوتے کہ ان سے سمجھ سکتے اور ان کے کان ایسے ہوتے کہ ان سے سن سکتے۔ یہ بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوتے ہیں۔

کیا وجہ ہے قرآن نے ایسے لوگوں کو جو بظاہر دیکھتے، سنتے اور سوچتے ہیں ان کے لیے جانور کے الفاظ استعمال کیے ہیں انگریزی میں دیکھنے کے لیے دو الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان میں سے

ایک Look اور دوسرا See ہے بظاہر دونوں کے معنی دیکھنے کے ہیں مگر مفہوم دونوں کا الگ ہے۔ Look سے مراد کسی شئے کا سرسری جائزہ ہے جب کہ See سے مراد کسی شئے کے بارے میں پوری طرح غور وفکر کر کے اس کی اصل ماہیت کے بارے میں علم حاصل کرنا ہے۔ قرآن پاک نے جن لوگوں کے بارے میں کہا کہ وہ آنکھ، کان اور دل ہونے کے باوجود اندھے، بہرے اور فکر سے عاری ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ وحی الٰہی کو اپنا رہبر اور رہنما نہیں مانتے اور دیگر ذرائع علم کو اہمیت دیتے ہیں، جب کہ وحی نے دوسرے ذرائع علم کی نفی نہیں کی ۔ اللہ رب العزت نے وحی کے ذریعے انسان کو خیر وشر کا علم بخشا یہی اصل علم ہے باقی جتنے بھی ذرائع علم ہیں جن میں عقلی علم، وجدانی علم، تجربی علم یہ سب اس اصلی علم کے لیے شواہد مہیا کرتے ہیں یعنی ان کی حیثیت ثانوی ہے ۔ وحی الٰہی انسان کی فطری ضرورت ہے جس سے وہ اپنے ذرائع علم میں ایک ڈسپلن قائم کر سکے اس طرح وہ انارکی اور بدنظمی سے بچ سکتا ہے۔ پوپر نے اس حوالے سے لکھا ہے:

> Neither observation nor reason is an authority. Intellectual intitution almost important, but they are not reliable, they may show us things very clearly, and yet they may mislead us. They are indespensible as the main sources of our theories; but most of our theories are also false any way. The most important function of observations and reasoning and even of intuition and immagination, is to help us in the critical examination of those bold conjectures which are the means by which we probe into the unknown.(۲۸)

اسلام انسان کو صداقتوں اور حقائق سے آگاہ کرتا ہے، اللہ رب العزت نے اپنے ذاتی علم میں معتبر ترین ذریعہ علم یعنی وحی کے ذریعے اپنے انبیاء علیہ السلام کو آگاہ کیا۔ انہوں نے اس علم کو بنی نوع انسان تک پہنچایا۔ اس علم کی صداقت کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ رب العزت نے اپنے ذمے لیا۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

اِنَّـا نَحْنُ نَـزَّلْـنَا الذِّكْـرَ وَاِنَّا لَـهٗ لَحَافِظُوْنَ (۲۹) بیشک ہم ہی نے یہ ذکر (قرآن پاک) نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

فلسفے کے تین اسلوب ہیں قیاسی، ہدایاتی اور تجزیاتی۔ تعلیمی فلسفہ، قیاسی اس وقت ہوتا ہے جب یہ انسانی فطرت اور معاشرہ کے بارے میں نظریات قائم کرتا ہے جب کہ تعلیمی فلسفہ ہدایاتی تب ہوتا ہے جب یہ تعلیمی مقاصد کا تعین کرتا ہے اور تجزیاتی اس وقت ہوتا ہے جب یہ ان تصورات کی معقولیت کی جانچ پڑتال کرتا ہے جو ایک ماہر تعلیم قائم کرتا ہے لیکن اسلام کی تعلیم قیاس پر مبنی نہیں بلکہ یہ انسان کو اصل حقائق سے روشناس کراتی ہے۔ یہ ایسے حقائق ہیں جو انسانی تجربات سے بالاتر ہیں اور ان تک انسانی عقل اور حواس کی رسائی نہیں ہوسکتی۔

شروع میں ہم نے ایک سوال اٹھایا تھا کہ انسان یہ جاننا چاہتا ہے کہ حقیقت مطلقہ کیا ہے۔ فلسفہ اور سائنس اپنی طبع آزمائی کر چکے ہیں مگر وہ ابھی تک کسی حتمی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے لیکن اسلامی نقطہ نظر سے حقیقت مطلق اللہ رب العزت کی ذات ہے۔ اسلام نے تمام باطل نظریات کو مسترد کیا ہے۔ اسلام کے نزدیک اللہ رب العزت ایک یکتا ہستی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے اَللّٰـهُ لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ جو کہ صاحب شعور اور صاحب ارادہ ہے فَعَّـالٌ لِّمَا یُرِیْدُ وہ واحد ہی نہیں احد ہے قُـلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اللہ رب العزت اس وقت بھی موجود تھا جب کہ کائنات ابھی تخلیق ہی نہیں ہوئی تھی ثُـمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ اور اس وقت بھی موجود رہے گا جب یہ کائنات ختم ہوجائے گی كُـلُّ مَنْ عَـلَیْهَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ اللہ رب العزت ہی کائنات کی ہر شئے کا خالق ہے اَللّٰهُ خَـالِقُ كُلِّ شَیْءٍ اس کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ وَمَا تَسْـقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا آسمانوں کی بلندی اور زمین کی تہہ میں جو کچھ ہے وہ سب اس کے علم میں ہے۔ عَـالِمُ الْـغَیْـبِ وَالشَّهَـادَةِ اس کا اقتدار پوری کائنات پر محیط ہے۔ وَسِـعَ كُـرْسِیُّـهُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ وہ سب سے حساب لے سکتا ہے مگر اس سے حساب لینے والا کوئی نہیں۔ لَا یُسْـئَلُ عَـمَّـا یَـفْـعَـلُ وَهُـمْ یُسْـئَلُوْنَ ساری کائنات اس کی ملکیت ہے لَـهٗ مُلْکُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ اس کے مثل کوئی اور نہیں ہوسکتا لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ اللہ زماں ومکاں

کی قید سے آزاد ہے۔ فَاَيۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ اللہ جو چاہے کرسکتا ہے اس میں کوئی دوسرا رکاوٹ نہیں بن سکتا وَمَا اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ وہ واحد ہے اور ہمیشہ واحد رہے گا فَاِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۔اس کا کوئی شریک نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ فلسفہ میں ایک بحث یہ بھی ہے کہ اللہ کلیات کا علم رکھتا ہے یا جزئیات کا۔ قرآن پاک نے فلسفے کے اس مسئلے کو بھی حل کردیا کہ اللہ دونوں کا علم رکھتا ہے يَعۡلَمُ سِرَّكُمۡ وَجَهۡرَكُمۡ اللہ کے لیے ظاہر اور پوشیدہ برابر ہیں وَهُوَ اللّٰهُ فِى السَّمَاوَاتِ وَفِى الۡاَرۡضِ يَعۡلَمُ سِرَّكُمۡ وَجَهۡرَكُمۡ قرآن پاک نے جس انداز میں علم کی بات کی اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

بعض فلاسفہ کا خیال ہے کہ اللہ رب العزت نے ایک بار اس کائنات کو تخلیق کردیا اب اس کے ساتھ اس کا تعلق ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک گھڑی ساز کا گھڑی کے ساتھ۔ گھڑی کو جب مرمت کی ضرورت ہوتی ہے تو گھڑی ساز اس میں کچھ ردوبدل کرکے اس کے نظام کو درست کردیتا ہے۔ فلاسفہ کے اس گروہ کو Deist کہا جاتا ہے لیکن قرآن پاک نے اس تصور کی نفی کی ہے۔ يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الۡاَرۡضِ کائنات کے جتنے بھی امور ہیں ان کے پیچھے اس کی ذات ہے اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ کائنات پر اسی کی حکمرانی ہے ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ لَهُ الۡمُلۡكُ کائنات کی ہر شئے کے بارے میں علم رکھتا ہے قُلۡ لَا يَعۡلَمُ مَنۡ فِى السَّمَاوَاتِ وَالۡاَرۡضِ الۡغَيۡبَ اِلَّا اللّٰهُ ہر آن اس کی ایک نئی شان ہے كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِىۡ شَاۡنٍ ۔

اللہ رب العزت کی صفات کے بارے میں جو علم موجود ہے اس کو قرآن پاک کی دو آیات میں بیان کیا جاسکتا ہے ان میں ایک سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۵ ہے، ارشاد ربانی ہے:

اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الۡحَىُّ الۡقَيُّوۡمُ لَاتَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوۡمٌ لَهٗ مَا فِى السَّمَاوَاتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَشۡفَعُ عِنۡدَهٗ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ وَلَا يُحِيۡطُوۡنَ بِشَىۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرۡسِيُّهُ السَّمٰوَاتِ وَالۡاَرۡضَ وَلَا يَؤُدُهٗ حِفۡظُهُمَا وَهُوَ الۡعَلِىُّ الۡعَظِيۡمُ ۔

دوسری سورۃ الحشر آیت نمبر ۲۲-۲۴ میں ارشاد ربانی ہے:

هُوَ الَّذِىۡ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحۡمَانُ الرَّحِيۡمُ هُوَ

اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۔

علم کی بنیادی صفت انسان کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے جن سے اس کی سیرت و کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔یعنی تزکیہ نفس ۔اس کے بعد دوسرا پہلو اطاعت الٰہی کا ہے یوں انسان اپنے افکار کے ساتھ ساتھ اعمال میں اصلاح کرتا ہے اور اس کے قول و فعل میں تضاد نہیں رہتا ہے۔اس کے بعد رضائے الٰہی کا پہلو آتا ہے جس سے انسان کی پوری زندگی پاکیزہ اور بامقصد بن جاتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک انسان خواہ کتنا ہی اعلی سند یافتہ ہو جب تک اس کی ہر بات معرفت الٰہی ،اطاعت الٰہی اور رضائے الٰہی کے تابع نہیں ہو جاتی اس وقت تک اس کی تخلیق کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ امت مسلمہ کو اس علم سے متعارف کرایا جائے جو ایسے انسان پیدا کرے جن کی فکر پاکیزہ ہو جو اپنے کردار و سیرت میں اپنی مثال آپ ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کی سائنسی ترقی کے بارے میں بھی علم رکھتے ہوں ۔اس کے لیے قرآن پاک کے ساتھ تعلق جوڑنا ضروری ہے۔ہمیں اس وقت جتنے بھی مسائل کا سامنا ہے اس کا واحد حل نظام تعلیم میں تبدیلی ہے۔اللہ رب العزت نے انسان کی تخلیق ہی اس انداز میں فرمائی کہ اس میں جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ ظاہری حواس خمسہ کے علاوہ باطنی حواس خمسہ بھی ہیں ۔موجودہ نظام تعلیم ظاہری حواس خمسہ کی کسی حد تک تشفی تو کر دیتا ہے مگر باطنی حواس خمسہ کی تشفی کا واحد حل قرآن پاک سے ناطہ جوڑنے سے ہی ممکن ہے۔انسان نے سائنسی علوم میں اتنی ترقی کی ہے کہ آج اسے زندگی کی تمام سہولیات میسر ہیں لیکن دوسری طرف روحانی ترقی کا گراف روز بروز نیچے جارہا ہے جس کی وجہ سے تمام تر سہولیات کے باوجود انسان کو سکون میسر نہیں اس کی اصل وجہ باطنی حواس خمسہ کی علم کی تڑپ ہے جو ان کی ضرورت ہے۔جس طرح زندہ رہنے کے لیے جسم کو خوراک کی ضرورت ہے اسی طرح روح کو اپنی خوراک کی ضرورت ہے جو موجودہ نظام تعلیم پورا نہیں کرسکتا۔روح کی خوراک صرف تلاوت قرآن پاک سے یا نماز سے پوری نہیں ہوتی بلکہ اصل معاملہ عمل کا ہے اور عمل کے لیے

تربیت کی ضرورت ہے۔ ہمارے اس سارے نظام میں تربیت کے لیے کوئی پالیسی نہیں ہے جب تک ہم اس نظام کو نہیں بدلتے تب تک ہماری بے چینی، اضطراب، دہشت اور خوف کی کیفیات میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔ اس کے لیے من حیث القوم سوچنے کی ضرورت ہے۔ مختلف نظام ہائے تعلیم سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا کیونکہ ماحول جیسا بھی ہو انسان کی فطرت ہر جگہ یکساں رہتی ہے۔ اگرچہ معاشرے میں فرد کا کردار مختلف ہوسکتا ہے لیکن بحیثیت انسان ہر دور میں اس کا کردار یکساں رہتا ہے۔ اس کے کردار کا تعلق اس کی فطرت سے ہے اور فطرت تمام انسانوں کی یکساں ہے۔ ماحول کی تبدیلی اگرچہ اس کے کردار کو متاثر کرتی ہے لیکن یہ اثر دیرپا نہیں ہوتا کبھی نہ کبھی وہ اپنی فطرت کی طرف واپس لوٹ کر آتا ضرور ہے۔ یہ بات اس کی جبلت میں شامل ہے۔ علم کا اصل مقصد روح کی بالیدگی ہے جو ٹھوس سے مجرد اور حسی سے روحانی حقائق کی جانب ترقی کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ علم حاصل کرنے میں دعا کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کوشش کرنا انسان کا کام ہے لیکن نتیجہ اللہ رب العزت کا مرہون منت ہے۔ اگر علم حاصل کرنا خود انسان کے بس میں ہوتا تو یہ دعا نہ سکھائی جاتی کہ:

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۳۰) اے میرے رب میرے علم میں اضافہ کر۔

علم کا سرچشمہ خود قرآن پاک ہی ہے جو ہمارے پاس اللہ رب العزت کی وحی کی صورت میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام علوم کے بارے میں اس میں رہنمائی ملتی ہے۔

حوالہ جات

(۱) القرآن ۲۳: ۷۸۔ (۲) القرآن ۳۹: ۱۸۔ (۳) القرآن ۲: ۱۶۴۔ (۴) القرآن ۲: ۱۔ (۵) القرآن ۲: ۲۳۔ (۶) القرآن ۲۵: ۷۳۔ (۷) القرآن ۹۱: ۸۔ (۸) القرآن ۱۳: ۱۰۲۔ (۹) القرآن ۴۲: ۵۱۔ (۱۰) ڈاکٹر رب نواز: اسلام اور علم کے ذرائع، ادارہ تعلیمی، لاہور ۲۰۰۲ء، ص ۷۹۔ (۱۱) بحوالہ وحید الدین: مذہب اور جدید چیلنج، فضلی سنز کراچی، ص ۱۶۔ (۱۲) القرآن ۵: ۷۴۔ (۱۳) القرآن ۲۱: ۴۴۔ (۱۴) سید ابوالاعلی مودودی: تفہیم القرآن، جلد پنجم، سورہ نحل، حاشیہ ۵۶۔ (۱۵) ابن منظور: لسان العرب، تحت اللفظ ''وحی''۔ (۱۶) القرآن ۱۵: ۱۶۔ (۱۷) القرآن ۱۷: ۳۶۔ (۱۸) القرآن ۱۳: ۱۰۵۔ (۱۹) القرآن ۲۲: ۴۶۔ (۲۰) القرآن ۲: ۱۷۰۔ (۲۱) القرآن ۹۹: ۴-۵۔ (۲۲) القرآن ۱۶: ۶۸-۶۹۔ (۲۳) القرآن ۷: ۱۷۹۔ (۲۴) Karl Popper, Conjectures and Refutation p.28۔ (۲۵) القرآن ۱۵: ۹۔ (۲۶) القرآن ۲۰: ۱۱۴۔

ناصر علی سرہندی، سبک ہندی کا نمایندہ شاعر

ڈاکٹر زرینہ خان

عہد مغل میں اور خصوصاً بادشاہ اکبر کے دور میں شعراء نے جس خاص طرز سخن کی داغ بیل ڈالی تھی اس نے رفتہ رفتہ ہندوستان میں لکھی جانے والی نظم ونثر دونوں کو متاثر کیا۔ ہندوستان کے فارسی گو شعرا اور ادباء فیضیؔ اور ظہوریؔ جیسے خیرہ کنندہ اور باکمال صاحبان ہند کی ہوش رُبا نظم و نثر کی صناعی اور تابناکی سے ایسے مبہوت اور متاثر ہوئے کہ وقت کے ساتھ ایران کے قدیم طرز کو فراموش کرتے گئے۔ ان کا سرمشق اب حافظؔ اور سعدیؔ کا کلام نہیں بلکہ عرفی اور ابوالفضل کی نظم و نثر تھی۔ لب ولہجہ کی سادگی کی جگہ صناعی، تخیل اور پر پیچ تراکیب و اصطلاحات نے لے لی تھی۔ بے ساختگی اور روانی کا مقام تصنع و آرائش لفظی نے حاصل کرلیا تھا اور شعر احساس سے گزر کر ادراک وافکار کی منزل میں آگیا تھا۔ یہ طرز سخن ''سبک ہندی'' کے نام سے جانا گیا۔ جو صاحبان نظر وسلیقہ تھے انہوں نے اس تغیر سبک اور تبدیلی ادا کو ایک نظم وضبط کے ساتھ برتا جس سے ان کے کلام میں مزید حسن وکشش ولطافت پیدا ہوئی لیکن افراطیوں نے اس مصنوعی طرز نگارش اور پر پیچ طریقۂ ادا کو کچھ ان حدوں کو پہنچا دیا کہ صاحبان ذوق کے نظر ودل محظوظ ہونے کے بجائے مجروح ہونے لگے۔ البتہ اورنگ زیب کے عہد میں شعرا نے لفظی آرائش وتجملات کے ساتھ ساتھ معنوی بلندی کو اہم قرار دیا۔ اس عہد کے شعراء میں ناصرؔ علی سرہندی کا خاص مقام ہے۔ ناصرؔ علی کی سخن گوئی کا تجزیہ کرنے سے پیشتر ان کے حالات زندگی کے متعلق آگاہی حاصل کرنا قارئین گرامی کے لیے مفید ہوگا۔

ناصرؔ علی سرہند پنجاب کے سید خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد کا نام رجب علی

شعبہ فارسی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

بیگ تھا (۱)، ان کی ولادت سرہند میں ہوئی۔ اپنے وطن میں ہی انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے سیف خان کی ملازمت اختیار کرلی اور جب عالم گیر نے سیف خان کو الہ آباد کا گورنر بنا کر بھیجا تو ناصر علی اس کے ہمراہ گئے۔(۲)، سیف خان کی وفات کے بعد ۱۱۰۰ھ میں ناصر علی سرہند سے بیجاپور گئے (۳)، انہوں نے عالم گیر سے ملاقات کی لیکن عالم گیر کو ان کا بے پروا اور بے نیاز مزاج پسند نہیں آیا۔ ناصر علی عالم گیر کے وزیر اعظم ذوالفقار خان بن اسد خان سے وابستہ ہوگئے۔ ذوالفقار خان کی مدح میں انہوں نے ایک غزل کہی جس کا مطلع ملاحظہ ہو:

ای شان حیدری ز جبین تو آشکار
نام تو در نبرد کندکار ذو الفقار (۴)

جب ذوالفقار خان ۱۱۰۳ھ میں تسخیر کرناٹک کی مہم پر روانہ ہوا تو ناصر علی اس کے ساتھ تھے اور کافی عرصے تک وہاں مقیم رہے۔ دوران قیام وہ شاہ حمید مجذوب کے معتقد ہوگئے اور ان کی مدح میں ذیل کے اشعار کہے:

اینک اینک ساقی شیریں رسید نوبت جام حمید الدین رسید
جام او خورشید ربانی بود انجمن افروز سبحانی بود (۵)

ناصر علی کے ممدوحین میں شاہ عادل پسر شریف خان اور غضنفر خان (جو ذوالفقار خان کے دوست تھے) ہیں۔ غضنفر خان کی مدح میں ناصر علی نے یہ شعر کہا ہے:

ہم چو پیل بے جگر مے گریز داز میدان ما
بشنو کز کوہ آواز غضنفر خان ما (۶)

قیام دکن کے دوران ناصر علی کی ملاقات ان کے ہم عصر شاعر بزرگ میر عبدالجلیل بلگرامی سے ہوئی۔ دوران ملاقات دونوں اہل سخن ایک دوسرے کے ثنا خوان ہوئے۔ میر عبدالجلیل نے اپنی ایک مثنوی ان کی نذر کی جو انہوں نے ایک وفادار غلام کی مدح میں کہی تھی۔ ناصر علی کو مثنوی بہت پسند آئی اور انہوں نے اس مثنوی کا نسخہ طلب کیا، جس کو بعد میں میر صاحب نے ارسال کیا۔ اس مثنوی کا مطلع ہے:

بیا ای خامۂ ماتم روایت
پریشان ساز گیسوی حکایت (۷)

آخر عمر میں ناصر علی دکن سے دارالسلطنت دہلی آ گئے اور یہیں ۱۱۰۸ھ/ ۱۶۹۶ء میں انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور انہیں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔(۸)

ناصر علی شیخ معصوم سرہندی کے زیر اثر تصوف کے دائرے میں وارد ہوئے اور سلسلۂ نقشبندی سے وابستہ ہوئے۔(۹)

ناصر علی کا شمار ہندوستان کے تین بڑے شعراء میں ہوتا ہے جن میں دوسرے دو شاعر بیدلؔ اور غنیؔ کشمیری ہیں، مختلف تذکرہ نگاروں نے ناصر علی کو ہندوستان کا مایہ ناز شاعر قرار دیا ہے۔

صاحب کلمات الشعراء نے انہیں آبروئے ہندوستان قرار دیا ہے۔(۱۰) سفینۂ خوشگو کے مولف کا کہنا ہے کہ ناصر علی نے پانچ ہزار سے زیادہ اشعار کہے ہیں اور پانچ سو اشعار ان کے دیوان میں بہترین ہیں۔(۱۱)

ناصر علی کے کلام کو ان کی زندگی ہی میں مقبولیت مل گئی تھی اور یہ شاعر کے کلام کی بلندی اور جاذبیت کی سند ہے۔ ناصر علی کے متعلق مولانا آزاد بلگرامی تذکرہ ''سرو آزاد'' میں رقم طراز ہیں:

''شیر نیستان سخنوری است و مرد میدان معنی گستری، ذوالفقار کلکش
بہ تسخیر قلم رو بیان پرداختہ و تصرف طبعش آفتاب سخن را از افق غربی راجع ساختہ۔
گل وارستگی بر سر داشت و جام استغناء در دست''۔(۱۲)

خود ناصر علی کو اپنے کلام کی شہرت اور مقبولیت اور اپنی شاعرانہ عظمت و برتری کا شدید احساس تھا۔ چنانچہ وہ اعتراف کرتے ہیں:

علی ہم طرح من عالم امکان نمی باشد
نہال قدس بود آواز من بیجا دمید اینجا (۱۳)

ناصر علی نے اپنے ہم عصر شعراء کا مذاق اڑایا ہے۔ ایران کے ملک الشعراء اور سبک ہندی کے عظیم مرتبہ شاعر صائبؔ تبریزی کے متعلق کہتے ہیں:

ایں غزل ناصرعلی اعجاز ہندوستان است
صائبؔ اینجا می نہد بر خاک تا محشر جبیں (۱۴)

اس شعر میں ناصرعلی نے نہ صرف اپنی شاعرانہ برتری کا اظہار کیا ہے بلکہ اسے خاک ہندوستان کا اعجاز کہا ہے۔ یہ ہندوستانی ہونے کا فخر یہ احساس ہے، غالباً اس زمانے میں ایران کے فارسی گوشعراء اپنے آپ کو ہندوستان کے شعراء سے برتر سمجھتے تھے اوران کی تخلیقات کو کمتر گردانتے تھے۔اسی احساس کے نتیجے میں ناصرعلی نے اس شعر میں اپنی شاعرانہ برتری کو سرزمین ہندوستان کا اعجاز کہا جو حب الوطنی کی بہترین مثال ہے۔ایسا نہیں کہ انہوں نے اپنے دیگر ہم عصر شعراء کے متعلق ایسی آراء کا اظہار کیا ہو بلکہ وہ اپنے ہم عصر شعراء میں نظیریؔ نیشاپوری کے نہایت قدردان تھے۔انہوں نے بیدلؔ کے کلام سے استفادہ بھی کیا ہے۔قدیم ایرانی شعراء میں وہ حافظؔ شیرازی اور مولانا رومیؔ کے مداح تھے،حافظ شیرازی سے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار اس شعر میں کیا ہے:

از علی قاصد سلامی بلبل شیراز را بوسہ زن بر خاک آن وادی و مشکین کن نفس (۱۵)

حافظ کی غزل کی زمین میں انہوں نے سخن دانی اور ہنر کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

علی امشب مئ شیراز در جام وسبو دارد الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا
علی در بحر حافظؔ دست و پای میزند ہرشب کجا دانند حال ما سبک ساران ساحل ہا (۱۶)

ناصرعلی نے اپنے ہم عصر شعراء کو متاثر کیا۔فطرتؔ موسوی اور غنیمتؔ کنجاہی جیسے ماہر سخن گویان، ناصرعلی کے طرز سخن سے متاثر ہوئے اوران کی پیروی کی۔ پروفیسر وارث کرمانی نے ناصرعلی کو بیدلؔ پر سبقت دی ہے اور کہا ہے:

> "Nasir Ali enjoyed tremendous reputation, perhaps more than anyother poet of his time. Even Bedil lacked the wide appeal and all round reputation of Nasir Ali". (۱۷)

ناصر علی کی تصنیفات میں دیوان، مثنویاں اور چند نثری نمونے ہیں۔ دیوان، غزلیات، رباعیات اور متفرق اشعار پر مشتمل ہے، بحیثیت مثنوی نگار بھی ناصر علی کا رتبہ بلند ہے۔ ان کی مثنوی کو شہرت و مقبولیت اور ہمہ گیری حاصل ہوئی۔ بقول مولانا آزاد بلگرامی نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران اور بغداد تک ان کی مثنوی کی شہرت پہنچی، بغداد میں تو صوفیائے کرام کی مجلس ذوق و سماع میں مثنوی ناصر علی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ (۱۸) ذیل میں مثنوی کے چند اشعار خوانندگان گرامی کی ضیافت طبع کے لیے نقل کیے جاتے ہیں:

سخن را آفریدم جا دمیدم باقرار خدائی بر گزیدم
الستی سر زد از من، او بلی منش با عبد او یا ربنا گفت (۱۹)

لیکن ناصر علی کی اصل ہنرنمائی غزل میں ہے۔ غزل ہی ان کا خاص میدان ہے اور اس صنف سخن میں ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ ان کی غزل سبک ہندی کی نمایندگی کرتی ہے اور اس میں سبک ہندی کی تمام خوبیاں اور صفات موجود ہیں یعنی ان کی غزل مصنوعی آرائشوں، ایہام و تمثیل، پیچیدگی اور مبالغہ کا مجموعہ ہے۔ فلسفیانہ، بے باک اور بے نیاز انداز کے باوجود ان کے طرز بیان میں دلکشی و دلنشینی ہے۔ جذبات و احساسات کا شدت کے ساتھ اظہار ہوا ہے، خودداری، انا اور عزت نفس ان کے مزاج میں رچی بسی تھی، ایسے اشعار جن میں وہ اپنی خودداری اور عزت نفس کا ذکر کرتے ہیں، ان میں ایک خاص سرمستی کی سی کیفیت نظر آتی ہے اور شعر آب رواں کی مانند ان کے ذہن میں آتے ہیں، نئی نئی تشبیہات و استعارات کے ساتھ ان کا فن بام عروج پر نظر آتا ہے۔ مثلاً ذیل کا شعر ملاحظہ ہو:

ما گرفتاران ہستی را بہ چشم کم مبیں
بوی یوسف می دہد ہر ذرہ در زندان ما (۲۰)

یعنی فقراء کو جو ہستی کی قید میں گرفتار ہیں، انہیں حقارت کی نظر سے مت دیکھو کیوں کہ ہمارے قید خانے کا ہر ذرہ بوئے یوسف دیتا ہے۔ فقراء و درویش دنیاوی اعتبار سے کم مرتبہ نظر آتے ہیں لیکن روحانی طور پر اعلیٰ مدارج پر فائز ہوتے ہیں اور علم باطن سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے خودداری اور انا کا ذکر کیا ہے:

علی تار نفس در سینہ می جویم ، نمی یا بم
ز گوہر قطرہ دارد ابر نیسانی کہ من دارم (۲۱)

ان کی غزل میں فلسفے اور تصوف کی آمیزش نہایت لطیف پیرائے میں ہے کہ تصوف سے فلسفے کو جدا کرنا محال ہے۔ فلسفہ کے خشک اور غیر دل چسپ موضوع کو ناصر علی نے اپنے دل کش انداز میں اس طرح ادا کیا ہے جو خوانندہ کے دامن دل کو کھینچتا ہے۔ تجرد اور ترک دنیا، بے نیازی و بے پروائی جو ان کی زندگی کا مشرب تھا، اس کا ذکر ان کی غزلوں میں جا بجا ملتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں جو تجرد، فقر اور استغناء کی اہمیت اور افادیت کو واضح کرتے ہیں:

تجرد بی نیازم کردہ از آمیزش دنیا
ندارد گر چراغی خانۂ من سوختن دارم

تجرد مشربم پرواز من رنگ دگر دارد
چو گل یکساں نہ رہ طی می کنم از ریزش پرہا (۲۲)

ناصر علی نے اپنے عہد کے رواج کے مطابق ایہام اور تمثیل سے غزل کو نئے معنی دیے، فن تمثیل اور استدلال میں انہیں خاص مہارت حاصل تھی اور تمثیل کی مدد سے انہوں نے شعر کو معنوی بلندی عطا کی۔ مروجہ الفاظ و تراکیب کا استعمال کچھ اس ڈھنگ سے کیا کہ شعر کا لطف دوبالا ہو گیا اور نئے معنی پیدا ہو گئے۔ تمثیل نگاری میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سوختن زخمیست پنہاں در دل رنجور ما
ہم چو اخگر جوش خاکستر زند ناسور ما

بکف جز سنگ طفلان را نہ بینم تختۂ مشقی
زشوا عشق مجنونت خراب افتادہ مکتبہا

تا ثبات رنگ پیدا عشرت ہم غم است
چوں حنا رنگ سیاہ گیرد لباس ماتم است (۲۳)

فن تمثیل کی ابتداء فارسی شاعری میں امیر خسرو نے کی اور صائب تبریزی نے اس کو

بام عروج تک پہنچا دیا۔ عہد اورنگ زیب کے شاعر ناصر علی اور غنی کشمیری نے اس کو مستقل فن بنا دیا جو بعد کے آنے والے شعراء کے لیے پیروی اور ہنرمندی کا باعث ہوا۔

ناصر علی نے اصطلاحات میں جدت پسندی اور تشبیہات واستعارات کی ندرت وتازگی پر بھی بڑی توجہ دی اور روایتی مضامین کو جدید تشبیہات واستعارات کے پیرہن میں آراستہ کرکے کلام میں دل کشی ورعنائی پیدا کی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

درفیض است منشین از کشایش ناامید اینجا
برگ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا

دہان زخم را از ریزۂ الماس پر کردم
باین دندان لب تیغش گزیدن آرزو دارم

انتقام داد خواہان قیامت شد تمام
می فشاند چشم قاتل سرمہ بر شورم ہنوز (۲۴)

عہد عالم گیر کے شعراء کی غزل کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں موسیقی اور غنائیت کا عنصر غالب ہے۔ بیدلؔ، غنیؔ اور ناصرؔ علی کی غزلیں ترنم ریز ہیں، ناصر علی نے غزل میں ترنم اور موسیقی پیدا کرنے کے لیے طولانی بحور کا استعمال کیا اور الفاظ کی در و بست وتکرار سے موسیقی و نغمگی پیدا کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بچشم خود عروج نالہ دیدن آرزو دارم — سبک روحم باین شہر پریدن آرزو دارم
نمی گوید معتبر خواب پایم را چرا تعبیر — کہ پا در دامن عزلت کشیدن آرزو دارم (۲۵)

مضمون آفرینی اور تازہ گوئی میں ناصر علی کا منفرد مقام ہے، انہیں اس فن میں مہارت حاصل ہے۔ ذیل کے شعر میں انہوں نے جدت اور ندرت کے ساتھ یہ مضمون باندھا ہے۔ کہتے ہیں شب عید جب بام پر ''مہ نو'' دیکھنے کے لیے گئے آسمان پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ''مہ نو'' اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ فلک پر جلوہ افروز ہے اور کواکب غائب ہیں گویا ''مہ نو'' کے باعث انہوں نے اپنے قالب تہی کر دیے ہیں اور غائب ہو گئے ہیں۔ اس شعر میں حسن تعلیل ہے:

شب عید آمدی بر بام و بر گردوں نظر کردی — کواکب ہم چو ماہ نو تہی کردند قالبہا (۲۶)

ناصر علی نے غزل کے ساتھ رباعیات میں بھی مضمون آفرینی اور خیال بافی کے تانے بانے بنے ہیں، ان کی بیشتر رباعیات میں نادر مضامین اور فکر بدیع ہے، مثلاً ذیل کی رباعی ملاحظہ ہو:

سیل اشکم چو بکوی دوست راہی می شود　　　نالہ در پیراہن دل خار ماہی می شود
بی تو دکان مرکب ساز شد کاشانہ ام　　　گرچہ اغاں میکنم حاصل سیاہی می شود (۲۷)

مبالغہ آرائی اور غلو سبک ہندی کے شعراء کا طرۂ امتیاز ہے۔ ناصر علی بھی اس فن میں یکتا ہیں۔ دراصل مبالغہ اور غلو قصیدہ کا امتیازی وصف ہے لیکن چوں کہ عہد عالم گیر میں قصیدہ متروک تھا لہذا شعراء نے مبالغہ آرائی اور غلو کے لے غزل کو پسند کیا، چنانچہ اور اس عہد کی غزل کی شناخت اس وصف کے باعث ہونے لگی۔ ناصر علی کے علاوہ غنی کشمیری اور مرزا بیدل نے اس فن کو نئی بلندیاں عطا کیں۔ ناصر علی کی غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں مبالغہ اور غلو کا عنصر نمایاں ہے۔

از سرخاکی کہ آن شیریں شمایل بہ گزرد　　　بیضۂ طوطی شود خرمن بجائی دانہ ہا (۲۸)

عہد عالم گیر میں فلسفیانہ اور اخلاقی شاعری کو نہایت فروغ حاصل ہوا، غالباً اس کی وجہ اس زمانے کے معاشی حالات تھے، معاشرے میں گراوٹ اور پستی کی وجہ سے، اخلاق میں ابتذال آ گیا تھا، شعرا نے اپنی شاعری کے ذریعہ اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ چوں کہ اس دور میں بے جا پر بندش مدح سرائی اور تملق تھی اس لیے شعراء جو کچھ کہتے بادشاہِ وقت کو خوش کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے احساسات دروں اور خارجی عوامل سے متاثر ہو کر قلم اٹھاتے اور دل سے نکلنے والی آواز دل تک پہنچ جاتی، ناصر علی نے بھی پند و نصائح سے مملو و مزین اشعار کہے۔ سچائی اور حق پرستی کی تلقین کی اور انسان کو دنیا اور دنیا کی لذتوں سے باز رہنے کی ہدایت کی۔ بتایا کہ انسان کو ذات الٰہی سے غافل نہیں ہونا چاہیے اور خدا کی وحدانیت کا اقرار کرتے رہنا چاہیے۔ قناعت اور توکل کو اپنا شیوہ بنانا چاہیے اور خودداری اور عزت نفس کو کسی بھی حالت میں نہیں چھوڑنا چاہیے۔ خود ان کے مزاج میں فقر و استغناء اور بے نیازی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ذیل میں چند اشعار ملاحظہ ہوں جو ان کی شخصیت اور فکر کے ترجمان ہیں:

نکوئی گر رود زین بحر، نیکو تر شود پیدا
چو گیرد قطرۂ راہ عدم گوہر شود پیدا

غافل مشو زِ یاد خدا ، بیخبر مخواب

فریاد میکند نفست ، اینقدر مخواب(۲۹)

حواشی

(۱) سفینۂ خوشگو،ص ۱،مصنف بندرابن داس خوشگو،مطبوعہ لیبل لیتھو پریس، پٹنہ، بہار، ۱۹۵۶ء ۔(۲) خزانۂ عامرہ،ص ۳۲۸،تالیف غلام علی آزاد بلگرامی،مطبوعہ نول کشور، کانپور۔(۳) سروآزاد،ص ۱۳۰،تالیف غلام علی آزاد بلگرامی،مطبوعہ دخانی رفاہ عام، لاہور پنجاب، ۱۹۱۳ء۔(۴) دیوان ناصر علی،ص ۶۰،مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۷۹ء ۔(۵) سروآزاد،ص ۱۳۰ -۱۳۱ ۔(۶) ایضاً ۔(۷) ایضاً،ص ۲۶۱ ۔(۸ و ۹) ڈریمس فارگاٹن،ص ۲۹۱ ۔(۱۰) کلمات الشعراء،ص ۲۰۳،مولف محمد افضل سرخوش،مطبوعہ عالم گیر پریس، لاہور، ۱۹۴۲ء۔(۱۱) سفینۂ خوشگو،ص ۴ ۔(۱۲) دیوان ناصر علی،ص ۸ ۔(۱۳) سروآزاد،ص ۱۳۱ ۔(۱۴) ایضاً،ص ۹۳ ۔(۱۵و۱۶) دیوان ناصر علی،ص ۶۳ - ۳ ۔(۱۷) ڈریمس فارگاٹن،ص ۲۹۱ ۔(۱۸و۱۹) خزانۂ عامرہ، ص ۳۳۸ ۔(۲۰) دیوان ناصر علی،ص ۶ ۔(۲۱، ۲۲) ایضاً،ص ۴۷ ۔(۲۳) ایضاً،ص ۴-۳۰ ۔(۲۴) ایضاً، ص ۵۷ -۶۱ ۔(۲۵، ۲۶) ایضاً،ص ۴۷ - ۵۷، ۵ ۔(۲۷) ایضاً،ص ۱۰۸ ۔(۲۸) ایضاً،ص ۹ ۔ (۲۹) ایضاً،ص ۷، ۲۸ ۔

مآخذ

(۱) دیوان ناصر علی سرہندی،مطبوعہ نول کشور،لکھنؤ، ۱۸۷۹ء۔

تذکرہ سروآزاد، تالیف غلام علی آزاد بلگرامی،مطبوعہ دخانی رفاہ عام، لاہور پنجاب، ۱۹۱۳ء۔

تذکرۂ خزانۂ عامرہ،مولف غلام علی آزاد بلگرامی،مطبوعہ منشی نول کشور، کانپور۔

(۴) DREAMS FORGOTTEN، پروفیسر وارث کرمانی،مطبوعہ اے ایم یو پریس علی گڑھ، ۱۹۸۴ء۔

(۵) سفینۂ خوشگو،(ج ۳)،مولف بندرابن داس خوشگو،مطبوعہ لیبل لیتھو پریس، رمنہ روڈ، پٹنہ، ۱۹۵۶ء۔

(۶) کلمات الشعراء،(تذکرہ) محمد افضل سرخوش،مطبوعہ عالم گیر پریس، تحصیل بازار، لاہور، ۱۹۴۲ء۔

قصہ اور
انسانی زندگی کی ارضیت اور ماورائیت

جناب شمیم طارق صاحب

قصہ جو افسانہ و حکایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور واقعہ کے معنی میں بھی، انسان کے معاشرتی روابط، مہم جوئی اور قوت فکر و عمل سے عبارت ہے۔ جن قصوں کہانیوں میں پرندوں، جانوروں اور غیر مرئی قوتوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے وہ بھی انسانی ذہن کی ہی قوت تخییل کا کرشمہ ہیں لہذا یہ کہنا غلط نہیں کہ کتب سماوی میں بیان کیے ہوئے قصوں کے علاوہ جو قصے مشہور ہیں یا دوسرے لفظوں میں جو قصے انسانوں کے تخلیق کیے ہوئے ہیں ان میں انسان ہی قصہ گو ہے اور مرکزی موضوع اور کردار کے لحاظ سے خود قصہ بھی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انسان نے قصہ گو کی حیثیت سے جب بھی قصے کے مرکزی موضوع یا اپنی اور اپنے نوع کے لوگوں کی سرگزشت بیان کرنے کی کوشش کی ہے، زندگی کے جوہر، اس کی ذہنی، نفسی، قلبی قوت اور اس کے تسلسل یعنی پیدائش سے پہلے اور موت کے بعد کی کیفیت سے بے خبری کا مظاہرہ کر کے سننے والوں کو یہ کہنے کا موقع دیا ہے کہ

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

یہ صحیح ہے کہ وقت کے ساتھ حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم کے علاوہ مابعد الطبیعاتی علوم میں انسان کی بڑھتی ہوئی دل چسپی کے سبب معاصر ادب یا قصوں میں انسان کے اندر پیدا ہونے والی جنسی لہروں اور نفسیاتی کیفیتوں کی ترجمانی کی مثالیں سامنے آنے لگی ہیں۔ Puberty یا آغاز

فلیٹ نمبر ۲۷، مرزبان منش، فروٹ مارکیٹ، بائیکلہ، ممبئی۔

بلوغت بھی جو بچوں میں ۱۳ تا ۱۶ سال اور بچیوں میں ۱۲ تا ۱۵ سال کے درمیان جسمانی اور نفسیاتی تبدیلیاں پیدا کرتا یا جنسی جذبہ بیدار کر کے ان کو ایک قسم کے ہیجان اور تجسس میں مبتلاء کر دیتا ہے، قصہ گو کو متوجہ کر رہا ہے۔ Foetus اور Embryo بھی قصہ گو کے لیے نامانوس یا اجنبی لفظ نہیں رہ گئے ہیں۔ اس کے باوجود مجموعی طور پر زندگی کے بارے میں قصہ گو کا تصور اب بھی اتنا محدود اور اکہرا ہے کہ وہ پیدائش سے پہلے کی زندگی یا رحم مادر میں قطرہ کے مکمل انسان بننے کے عمل، موت کے بعد جسم کے مٹی کا جزو بن جانے کے باوجود ایک خاص قسم کی زندگی اور پھر سڑی گلی ہڈیوں سے انسان کے دوبارہ زندہ کیے جانے کی حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر ہے حالانکہ کتب سماوی کے علاوہ سائنسی تجربوں سے انسانی زندگی کی ابتداء وارتقاء اور نوعیت پر جو روشنی پڑتی ہے وہ تضادات سے خالی نہ ہونے کے باوجود بہت سے مشترکہ تصورات کی حامل ہے اور ان مشترکہ تصورات سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کو جسم کی زندگی تک محدود کیا جا سکتا ہے نہ پیدائش و موت کی درمیانی مدت تک۔ تصویر سے انسانی امراض کے علاج اور دنیا کے کسی بھی حصے میں مقیم مریض کے بال اور ناخن لے کر ان میں دوا ڈالنے کے عمل Bio Transmission Therapy سے اس مریض کو راحت پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی وجود کا تصور اس سے کہیں زیادہ وسیع اور جامع ہے جتنا عام طور سے سمجھا یا انسان کے تخلیق کیے ہوئے قصوں میں بیان کیا جاتا رہا ہے اور کلوننگ نے اس تصور کے برحق ہونے کی تصدیق بھی کر دی ہے۔ اس صورت میں کیا یہ ضروری نہیں کہ ادیب یا قصہ گو جو دنیا کی سب سے حساس مخلوق ہے اپنی تخلیقات میں انسانی زندگی کو اس کے تسلسل اور جملہ مضمرات و اسرار کے ساتھ پیش کرے؟

قصہ گو کی تخلیق میں زندگی کے تسلسل، مضمرات اور اسرار کے ادراک کا فقدان شاید اس لیے ہے کہ اس کی ظاہر بیں نگاہوں کا مشاہدہ بھی محدود ہے اور مطالعہ بھی۔ سائنس نے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ بھی نئے تجربوں اور نئے نتیجوں کو راہ دیتی ہیں کیوں کہ سائنس جدید تجربہ و تجزیہ کی منکر نہیں ہے۔ کتب سماوی میں بیان کیے ہوئے قصے حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں مگر ان کے لیے جو ان کتب پر ایمان لے آئے ہیں۔ البتہ بہت سے معاملات میں سائنس کی نارسائی نے کتب سماوی میں اعتقاد نہ رکھنے والوں کو بھی ان کی طرف رجوع کرنے کی تحریک دلائی ہے۔

ایسے انکشافات و موضوعات بھی سامنے آئے ہیں جن میں سائنسی انکشافات ان حقائق کی تصدیق کرتے نظر آتے ہیں جو صحف سماوی میں بہت پہلے بیان کیے جا چکے ہیں اور صحف سماوی میں بیان کیے ہوئے ان حقائق میں نوعیت کے فرق کے ساتھ بہت کچھ مشترک بھی ہے، مثلاً پیدائش سے پہلے کی زندگی کا اثبات ہندو مذہب سے بھی ہوتا ہے اور اسلام سے بھی۔ ''ابھیمنیو'' کو ''چکرویوہ'' بھید نے کی تعلیم اس وقت ملی تھی جب وہ رحم مادر میں تھے۔ ''مہابھارت'' میں انہوں نے خود اس واقعے کی روایت کی ہے۔ رحم مادر میں نفخ روح قرآن سے ثابت ہے اس لیے مسلمانوں کا مسلمہ عقیدہ ہے۔ اسی طرح نوعیت کے فرق کے ساتھ موت کے بعد زندگی کا اثبات ہندو مذہب بھی کرتا ہے اور اسلام بھی۔ مثلاً ہندو مذہب میں ''پنر جنم'' کو تسلیم کیا گیا ہے اور اسلام میں برزخی زندگی کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کی خبر دی گئی ہے۔ ''پنر جنم'' اور ''برزخی زندگی'' کی نوعیت میں بہت فرق ہے لیکن زندگی کے تسلسل یا موت کے ساتھ زندگی کے ختم نہ ہونے کے ثبوت کے طور پر پنر جم کے تصور کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور عقیدۂ برزخ و آخرت کو بھی۔ ان مشترکہ انکشافات و بیانات کو ذہن میں رکھ کر زندگی اور متعلقات زندگی کے حقائق جملہ اسرار و مضمرات کے ساتھ قصے میں بیان کیے جا سکتے ہیں۔

کسی ایک مضمون میں تمام کتب سماوی کے حوالے سے گفتگو ممکن نہیں اور پھر راقم الحروف کو اپنی کم علمی کا بھی اعتراف ہے اس لیے یہاں Embryology اور قرآن حکیم یعنی سائنس کی ایک شاخ اور صرف ایک مذہب کے حوالے سے زندگی کی حقیقت و نوعیت کو سمجھنے سمجھانے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ اہل علم جب دوسرے مذاہب کی کتابوں کے حوالے سے اس موضوع پر روشنی ڈالیں گے تو بہت سی ایسی حقیقتیں سامنے آئیں گی جو لوگوں کے علم میں نہیں ہیں۔

Embryology میں زندگی کی ابتداء اور نشو و نما کے بارے میں اب تک جو انکشافات ہوئے ہیں ان کا حاصل یہ ہے:

The life begins at the time fertilisation of the ovum. The Zygote that os formed is a single cell which goes and develops into fully formed adult. The part of this growth takes place inside

the uterus (pranatal period) and part of it takes place outside the uterus after birth. (post natal period). The growth and development taking place in prenatal period is more dramatic, when a single cell is converted into fully formed foetus, which resembles the adult in the external form and all the systems and organs are present. The penatal development involves the cell division. transformation or specialisation, migration and even the programmed cell death .....

Prenatal peroiod can be divide in two parts. The first eight weaks of this period is called as embryonic period and the developing life form is called as embryo. From nineth week to full term (till child birth) the developing life term is called as foetus and the period is called foetal period.

The postnatal period of growth and development extends from birth to about 25 years. The adulthood is reached by 25th year when the growth is complete and the bones are fully ossified. (Embryology for medical students. p.1, By: Sudheer Sawant, New Delhi. 2002.

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ زندگی کا آغاز Fertilisation of ovum کے ساتھ ہوتا ہے اور Fertilisation کے بارے میں یہ جتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کے بغیر ممکن نہیں ہے لہذا یہ سوال فطری ہے کہ وہ پہلا مرد اور پہلی عورت جن کے جنسی اختلاط سے افزائش نسل کا سلسلہ شروع ہوا، خود کیسے اور کب وجود میں آئے؟ نظریۂ ارتقاء کو ماننے والے اس سوال کا جواب شاید یہ دیں کہ حیاتیاتی تبدیلی کے نتیجے میں کوئی ایک شخص یا جوڑا

نہیں بلکہ ایک نوع وجود میں آئی اور پھر تخلیق کا سلسلہ شروع ہوا لیکن کتب سماوی کے بیانات کی روشنی میں پہلے مرد اور پہلی عورت کی تخلیق یقیناً الگ الگ انداز میں ہوئی اور پھر ان میں جنسی اختلاط کے نتیجے میں تخلیق کا جو سلسلہ شروع ہوا Embryology اس پر پار پانے کی کوشش کر رہی ہے:

قرآن حکیم نے پیدائش سے پہلے قطرے کے مکمل انسان بننے تک کے مراحل و مدارج مثلاً سلالة من طین ، نطفه ، علقه ، مضغه ، ہڈی بننے اور اس پر گوشت چڑھنے اور پھر اس میں روح پھونکے جانے کے مدارج کے ساتھ پیدائش کے بعد معاش و معاد اور پھر موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کا ذکر کر کے زندگی کو نہ صرف پیدائش سے پہلے کی زندگی اور موت کے بعد کی زندگی سے ہم رشتہ کر دیا ہے بلکہ زندگی کے تسلسل، مضمرات اور معنویت کے بیان کو بلاغت کا ایسا نمونہ بنا دیا ہے جو معجزہ کہے جانے کا مستحق ہے۔ سورۂ مومنون (آیت ۱۲-۱۵) میں ارشاد ہے:

> ’’ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا (کر) کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ۔ سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔ پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے۔ پھر قیامت کے روز یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے‘‘۔

سورۂ مومنون کی مندرجہ بالا آیات میں سب سے پہلے یہ بات بتائی گئی ہے کہ ’’ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا‘‘ بعض مفسرین نے سلالة من طین کا ترجمہ مٹی کے ست کے بجائے ’’چنی ہوئی مٹی‘‘ اور ’’گیلی مٹی کا خلاصہ‘‘ بھی کیا ہے جس کا ایک مطلب تو ابوالبشر حضرت آدمؑ کی تخلیق ہے۔ سورۂ مومن (آیت ۶۷)، سورۂ نوح (آیت ۱۷)، سورۂ انعام (آیت ۲۰)، سورۂ صافات (آیت ۱۱)، سورۃ الحجرات (آیت ۲۶) اور سورۂ رحمٰن (آیت ۱۴) میں حضرت آدمؑ کی تخلیق کے سلسلے میں تراب (خشک مٹی)، ارض (مٹی یا زمین)، طین (گیلی مٹی، گارا، بدبودار کیچڑ) اور صلصال (پکی مٹی، ٹن سے بجنے والی ٹھیکری) کا ذکر موجود ہے۔ یہاں اس کا ایک دوسرا مطلب انسانی نطفہ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ وہ غذا سے پیدا ہوتا ہے اور غذا مٹی سے حاصل ہوتی ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے لفظوں میں:

''......ابتدائی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ پھر آگے سلسلۂ تخلیق اس مٹی کے جزء لطیف یعنی نطفہ سے جاری کردیا گیا۔ جمہور مفسرین نے آیت مذکورہ کی تفسیر یہی لکھی ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سلالۃ من طین سے مراد بھی نطفۂ انسانی ہو کیونکہ وہ غذا سے پیدا ہوتا ہے اور غذا مٹی سے بنتی ہے''۔ (معارف القرآن، ششم، ص ۳۰۲)

ان آیات کے سلسلے میں کچھ اور مباحث اور نکات بھی ہیں جن پر اہل علم نے توجہ کی ہے، یہاں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں بلکہ یہ بتانا کافی ہے کہ پیدائش سے پہلے رحم مادر میں انسانی زندگی کا اثبات قرآن سے بھی ہوتا ہے اور Embryology سے بھی۔ دونوں کا اصرار ہے کہ زندگی کی ابتداء پیدائش سے پہلے ہوچکی تھی۔ قرآن حکیم نے رحم مادر میں تخلیق انسان کے سات مدارج اور سات مدارج کے درمیان کی مدت کو کہیں لفظ ثم سے (کچھ دیر سے ہونے والے تغیر) اور کہیں حرف فاء (بلا کسی تاخیر کے ہونے والے تغیر) سے بیان کرکے نہ صرف پیدائش سے پہلے کی زندگی کو پوری طرح واضح کردیا ہے بلکہ اس سے آگے کی دو آیات میں معاد یعنی انسان کے انجام کا ذکر کرکے یہ بھی واضح کردیا ہے کہ ہر پیدا ہونے والے کو ایک دن موت سے دوچار ہونا ہوگا۔ اس کے بعد قیامت کے دن زندہ اٹھائے جانے کا ذکر ہے اور پھر آسمان کی تخلیق کے ذکر کے ساتھ رب کائنات کے انعامات واحسانات کا ذکر کیا گیا ہے جس کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ انسان کو صرف پیدا کرکے نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اس کی نشوونما اور رہائش وآسائش کا سامان بھی پیدا کرنے والے ہی نے مہیا کیا ہے، مختصر یہ کہ قرآن حکیم میں زندگی کو جس تسلسل کی شکل میں پیش کیا گیا ہے وہ پیدائش اور موت کی درمیانی مدت تک محدود نہیں ہے اور Embryology تو رحم مادر میں زندگی کی تصدیق پہلے ہی کرچکی تھی، کلوننگ، بوسیدہ ہڈیوں سے انسان کے دوبارہ وجود میں آنے کی تصدیق کرکے Believers کے ساتھ Non Believers کو بھی موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں سوچنے کی ترغیب دے رہی ہے۔ نیند اور سکتہ سے متعلق سائنسی حقائق بھی موت وزیست سے متعلق بہت سے سوالوں کو جنم دیتے ہیں۔ نفسیاتی اور حیاتیاتی علوم نے بھی بہت سے ایسے انکشافات کیے ہیں جو Life after death کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں مگر ہمارے قصہ گو کے نزدیک زندگی اتنی ہی محدود آج بھی ہے جتنی محدود اور اکہری پہلے تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا

ہے کہ واقعیت کا نعرہ لگائے جانے کے باوجود انسان کے تخلیق کیے ہوئے بیشتر قصے مکمل زندگی یا زندگی کے تسلسل کی ترجمانی نہیں کرتے ۔ انتظار حسین اردو کے وہ واحد قصہ گو ہیں جنہوں نے انسان کے نہاں خانۂ روح میں جھانک کر اپنے بیان کیے ہوئے قصوں کی ذہنی فضاء کو بہت وسیع کردیا ہے ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ قصص و حکایات اور اساطیر و تمثیلات سے ان کی ذہنی وابستگی ہے ۔ قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں بھی ماورائیت کا احساس موجود ہے مگر یہ رجحان کہیں کہیں زندگی سے فرار کی شکل اختیار کرگیا ہے ۔ راجندر سنگھ بیدی نے انسانی وجود کی نفسیاتی حقیقتوں کو بہت خوب صورتی سے پیش کیا ہے اور اس پیش کش سے بھی زندگی کی ہی ترجمانی ہوئی ہے جو متنوع بھی ہے اور پر اسرار بھی، بعد کے کئی تخلیق کاروں نے بھی اپنے فن پاروں میں زندگی کے تنوع اور اسرار کو تخلیقی تجربہ بنانے کی کوشش کی ہے مگر زندگی کی بہت سی صورتیں آج بھی ایسے تخلیق کاروں کی تلاش میں ہیں جو زندگی کے قصے کی تکمیل میں ماورائی فضاء سے مدد تو لیں مگر ارضیت اور ان حقیقتوں سے منحرف نہ ہوں جن کی شہادتیں کتب سماوی سے سائنس و نفسیات کی کتابوں تک بکھری پڑی ہیں ۔

زندگی سے متعلق قصہ گو کے تصور میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کو گوشت پوست اور ہڈیوں کے مجموعے یا جسم تک محدود سمجھتا ہے حالانکہ زندگی نام ہے جسم ، روح اور نفس کے مجموعے کا ۔ جسم کا تصور نفس کے بغیر نہیں ہے، قطرہ اعضاء انسانی یا مکمل وجود میں اس وقت تبدیل ہوتا ہے جب مادہ کے ساتھ انسان کا نفس مرتبط ہوجاتا ہے ۔ قطرے کا گوشت پوست اور ہڈی میں تبدیل ہونا بذات خود اس حقیقت کی دلیل ہے کہ مادی جسم کی تخلیق کے پس پردہ ابتداء ہی سے غیر مادی عوامل بھی کارفرما رہے ہیں ۔ قرآن حکیم کی متعدد آیات میں انسان کی پیدائش کو مٹی کی طرف منسوب کیا گیا ہے لیکن دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم خلق اور عالم امر کی پانچ پانچ یعنی کل دس چیزوں کا مجموعہ ہے ۔ عالم خلق کے چار عناصر تو آگ ، پانی ، ہوا، مٹی ہیں پانچواں عنصر ان چاروں عناصر سے پیدا ہونے والا بخار لطیف ہے جس کو روح سفلی یا نفس کہا گیا ہے اور عالم امر کی پانچ چیزیں قلب ، روح ، سر ، خفی اور اخفی ہیں ۔ روح سفلی یا نفس ، روح علوی سے بہت سی کیفیات و آثار حاصل کرکے انسانی جسم میں سب سے پہلے مضغۂ قلبیہ سے تعلق قائم

کرتا ہے اور اسی تعلق کا نام زندگی ہے۔ نفخ روح کا مطلب نفس یا روح سفلی کا جسم میں پھیلی ہوئی باریک رگوں میں سرایت کر جانا ہے۔

نفس جس کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں۔فہم وشعور کی دولت سے نوازا گیا ہے اور نفس ہی اعضاء پر حکمرانی بھی کرتا ہے۔اسی کی اصلاح کے لیے کتب سماوی کا نزول ہوا۔ ہادی اور رہبر تشریف لائے۔قیامت میں اعمال کے بارے میں نفس سے ہی باز پرس ہوگی اور خود اعضاء جسم اس کے خلاف گواہی دیں گے۔

روح کو امر خداوندی کہیں یا عطیۂ ایزدی، وہ ایک ایسا جوہر تابناک ہے جو وراء الوراء ہونے کے باوجود ارباب بصیرت کو ہر دور میں دعوت فکر دیتا رہا ہے۔روح نہ ہوتی تو حیوانات و نباتات نشو ونما سے اور کائنات اپنی رونق سے محروم ہو جاتی۔روح کی ماہیت کو سمجھنا اگر چہ ممکن نہیں ہے مگر اس کا جوہر تابناک ہونا مسلم ہے۔اللہ نے مـن رّوحـی کہہ کر یعنی روح کی نسبت اپنی طرف کر کے تمام مخلوقات میں روح انسانی کا اعلیٰ واشرف ہونا واضح کر دیا ہے کیونکہ یہ بغیر مادے کے محض امر الٰہی سے پیدا ہوئی ہے۔

جسم، نفس اور روح کے ارتباط سے زندگی میں جو معنوی توسیع ہوئی ہے اس کے اثرات خواب و بیداری اور موت کی حالت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ بیداری کی حالت میں جسم، نفس اور روح تینوں یکجا ہوتے ہیں مگر نیند کی حالت میں نفس پرواز کر جاتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جسم اور روح کا تعلق برقرار رہنے کے باوجود محض نفس کے پرواز کر جانے کے سبب جسم اپنے اعضاء سے شعوری طور پر کوئی کام لینے سے قاصر ہوتا ہے۔روح اور نفس کے باہمی تفاوت پر اکثر اہل علم نے سورہ الزمر کی ۴۲ ویں آیت سے استدلال کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ہی نفوس کو ان کی موت کے وقت اور موت نہ طاری ہوئی ہو تو نیند کی حالت میں اٹھا لیتا ہے۔پھر ان نفوس کو روک لیا جاتا ہے جن کی موت کا فیصلہ ہو چکا ہے اور دوسروں کو ایک مقررہ وقت کے لیے اجسام کی جانب واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

موت کی حالت میں روح پرواز کر جاتی ہے لیکن ایک خاص نوعیت کے ساتھ جسم اور نفس کا تعلق باقی رہتا ہے۔ یہ خاص نوعیت یہ ہوتی ہے کہ نفس میں اگر چہ اس حالت میں یہ صلاحیت نہیں

ہوتی کہ وہ اعضاء کے ذریعہ اپنے تاثر کا اظہار کرسکے مگر وہ ماحول سے بیگانہ بھی نہیں رہتا۔ احادیث سے ثابت ہے کہ میت جنازے کے ساتھ چلنے والے لوگوں کی آہٹ تک محسوس کرتی ہے اس لیے موت کے بعد نفس کے روک لیے جانے کا یہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا کہ جسم کی طرف عارضی طور پر بھی نفس کی واپسی نہیں ہوتی بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ موت سے پہلے جس متصرفانہ شان سے نفس کی جسم کی طرف واپسی ہوا کرتی تھی، مرنے کے بعد اس کی وہ شان یا حیثیت باقی نہیں رہتی۔

مختصر یہ کہ زندگی نام ہے حیاتیاتی تسلسل اور جسم، نفس اور روح کی باہمی رفاقت کا۔ جسم سے انسان کے ارضی تعلق یا زندگی کی ارضیت کا اور نفس و روح سے اس کی ماورائیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ہمارے شاعروں نے زندگی کے تسلسل اور توسیع کے ادراک یا دوسرے لفظوں میں زندگی کی ارضیت اور ماورائیت کو خوب صورت شعری تجربوں میں ڈھالنے میں بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں، مثلاً اقبال نے کہا ہے:

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات
مختلف ہر منزل ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ زندگی اور زندہ معاشرہ کی کسی حقیقت کو قصہ بنا کر پیش کرنے والوں میں سے بیشتر نے پیدائش و موت کے درمیان کی زندگی کو ہی کل زندگی بنا کر پیش کیا ہے جس کو سن کر سننے والوں کے شعور و لاشعور سے نہ صرف یہ آواز آتی ہے کہ

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

بلکہ ذہن میں یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ زندگی کے جس تسلسل اور توسیع کو کتب سماوی میں پہلے ہی بیان کیا جاچکا تھا اور سائنس و نفسیات کے عالم اب بیان کررہے ہیں، قصہ گو اس کے ادراک سے یا دوسرے لفظوں میں زندگی کی ارضیت اور ماورائیت کے احساس سے اب تک عاری کیوں ہیں؟

فریدالدین مسعود گنج شکرؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے باہمی تعلقات پر ایک نظر

جناب فیروزالدین احمد فریدی

فریدالدین مسعود گنج شکرؒ (باباصاحب) اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ (خواجہ صاحب) کے باہمی تعلقات کی نوعیت کو ایک فقرے میں سمونا ہو تو وہ یہ ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کے محبّ اور محبوب تھے۔ اس تعلق کا دوسرا نمایاں پہلو غایت درجے کا وہ ادب اور احترام تھا جو خواجہ صاحبؒ کو باباصاحبؒ سے تھا۔

باباصاحبؒ کا انتقال تقریباً ۹۰ برس کی عمر میں ۵ / محرم ۶۹۰ھ (وسط اگست ۱۲۷۱ء) کو ہوا۔ اس طرح ۵ / محرم ۱۴۲۹ھ (جنوری ۲۰۰۸ء) کو یہ ثانی ہستی کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئی، قمری تقویم کے مطابق ۷۵۹ برس اور عیسوی کیلنڈر کے مطابق ۷۳۶ سال ہو گئے۔ خواجہ صاحبؒ کا انتقال تقریباً ۶۷ برس کی عمر میں ۱۸ / ربیع الثانی ۷۲۵ھ (اوائل اپریل ۱۳۲۵ء) کو ہوا۔ اس طرح ۱۸ / ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ (اپریل ۲۰۰۸ء) کو ان کے وصال کو قمری تقویم کے مطابق ۷۰۴ برس اور عیسوی کیلنڈر کے مطابق ۶۸۳ سال پورے ہو چکے ہیں۔ باباصاحبؒ اور خواجہ صاحبؒ کی عمروں میں تقریباً ۶۷ برس کا فرق تھا جو پَر دادا اور پر پوتے کی عمروں میں پایا جاتا ہے۔

ہماری پرانی تاریخ کا المیہ ہے کہ یہ بادشاہوں کی تاریخ ہے، جو ان کی جنگی مہمات، عمارات فتوحات اور شکستوں کے ذکر سے تو لبریز ہے لیکن ایک آدھ کتاب چھوڑ کر اس میں اس عہد کے عوام کی حالت اور اس زمانے کے مشہور اور باکمال علماء اور صوفیہ کے حالات زندگی بلکہ بعض اوقات نام

کھتوال ہاؤس، A-54، اسٹریٹ نمبر ۱۵، باتھ آئی لینڈ، کراچی، پاکستان۔

تک نظر نہیں آتے۔ ہماری خوش بختی ہے کہ بابا صاحبؒ اور خواجہ صاحبؒ کے باہمی تعلقات کے بارے میں ہمارے پاس ایک ایسی مستند اور تاریخی دستاویز موجود ہے جو کوہِ نور سے زیادہ گراں قدر ہے۔ اس کا نام ''فوائد الفواد'' ہے جس کے معنی ہیں ''دل کے فوائد''۔ یہ کتاب خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ان تصدیق شدہ ملفوظات پر مشتمل ہے جو ان کے ایک انتہائی عقیدت مند مرید نے تقریباً سات سو سال پہلے نہ صرف انتہائی احتیاط سے قلم بند کیے بلکہ اس کے بعد ان کی خواجہ صاحبؒ سے تصدیق بھی کرائی۔ چودھویں صدی عیسوی میں لکھنے کے بعد تصدیق کرانے کا یہ عمل ناقابل یقین لگتا ہے۔

''فوائد الفواد'' کے مولف خواجہ حسن علا سجزی ہیں جنہوں نے ۱۸۸ مجلسوں میں جو شعبان ۷۰۷ھ (جنوری ۱۳۰۸ء) سے لے کر شعبان ۷۲۲ھ (ستمبر ۱۳۲۲ء) تک تقریباً پندرہ برسوں کے دوران، دلی میں خواجہ صاحبؒ کے جماعت خانے میں منعقد ہوئیں، خواجہ صاحبؒ کے یہ ارشادات اپنے ہاتھ سے قلم بند کیے۔ شعبان ۷۲۲ھ کے صرف ڈھائی برس بعد ۱۸/ ربیع الثانی ۷۲۵ھ (اوائل اپریل ۱۳۲۵ء) کو خواجہ نظام الدین اولیاؒ اپنے پالن ہار کی طرف لوٹ گئے۔

خواجہ صاحبؒ کو بابا صاحبؒ سے جو بے پناہ محبت تھی وہ خواجہ صاحبؒ کے قلب پر نازل کردی گئی تھی۔ کیا عجب کہ یہ محبت اس وقت پھونک دی گئی ہو، جب عالم بالا میں ارواح کا پہلی بار ملاپ ہوا تھا؟ اس دنیا میں اس بے پناہ محبت کا اظہار بابا صاحب کو دیکھے بغیر اور صرف ان کا نام سن کر ۱۲ سالہ نظام الدین سے پہلی بار اس وقت ہوا جب خواجہ صاحب طفل مکتب تھے اور تقریباً نصف صدی بعد خواجہ نظام الدینؒ بوڑھے ہو چکے تھے اور فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کو گزرے بھی تقریباً نصف صدی بیت چکی تھی، اس محبت کی شدت اور حدت میں رمق بھر کمی نہیں آئی تھی۔ اضافہ یوں نہیں ہوا کہ اضافے کی گنجائش نہ تھی۔ یہی حال بابا صاحبؒ کا تھا۔ جب انہوں نے پہلی بار خواجہ صاحبؒ کو دیکھا تو اس سے پہلے کہ ۲۰ سالہ نوجوان نظام الدین اپنا تعارف کرائیں، ۸۷ سالہ فریدالدین مسعودؒ کے شکر بار ہونٹوں سے وہ شہرۂ آفاق شعر نکلا جس کی حدت احساس اور شدت جذبات کو ہر وہ انسان محسوس کرسکتا ہے جس کے پہلو میں دل اور دل میں درد ہے۔ یہ تو آغاز کی داستان ہوئی۔ مستند تاریخ اس امر کی بھی شاہد ہے کہ اس کے تین برس بعد اپنی زندگی کی آخری

چند گھڑیوں میں بھی ۹۰ سالہ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کی زبان پر ۲۳ سالہ نوجوان نظام الدینؒ کا نام آتا رہا۔ اگلی سطور میں محبت اور ادب کے ان چند واقعات کا مختصر ذکر ہے۔

۱۲ سالہ نظام الدین بدایوں کے ایک مدرسے میں پڑھ رہے تھے کہ ابوبکر نامی ایک شخص ملتان اور اجودھن (حال پاک پتن) سے جہاں گردی کرتا سیکڑوں میل دور بدایوں پہنچا یا پہنچایا گیا۔ سات صدی پہلے کسی غیر سیاح کے اتنے دور دراز علاقے تک پہنچ جانے کو ''پہنچایا جانا'' ہی کہا جاسکتا ہے۔ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

باتوں باتوں میں بابا صاحبؒ کا ذکر آ گیا۔ ذکر آنا تھا کہ بدایوں کا یہ ۱۲ سالہ معصوم طالب علم ملتان میں پیدا ہونے والے اور دلی اور ہانسی سے اجودھن کی طرف ہجرت کرنے والے اس ۸۰ سالہ شیخ کی محبت میں ایسا فنا ہوا کہ جب تک اپنی ہر نماز کے بعد دس دس بار ''شیخ فریدالدین'' اور ''مولانا فریدالدین'' نہ کہہ لیتا، جی کو قرار نہ آتا۔

یہ کیفیت اسی وقت طاری ہوتی ہے جب کوئی کسی کے وجود پر چھا جائے، ورنہ کہاں اجودھن اور کہاں بدایوں؟ کہاں ایک ۱۲ سالہ لڑکا اور کہاں ایک ۸۰ سالہ بوڑھا؟ اور پھر یہ کہ نہ بات کی، نہ دیکھا، بس نام سنا اور نام کی مالا جپنے لگے۔ پاک محبت کی یہ پاکیزہ مہک پورے بدایوں میں ایسی پھیلی کہ اس طالب علم کے دوست اسے کسی بات پر قسم دلانا چاہتے تو کہتے ''اچھا اگر یوں ہے تو پہلے شیخ فریدؒ کی قسم کھاؤ'' ان دیکھی محبت ان دیکھی ضرور ہوتی ہے لیکن بلا سبب نہیں ہوجاتی۔ یہ مسبب الاسباب کا ایک اسرار اور انعام ہوتا ہے۔ اسرار اسرار ہوتا ہے چنانچہ پوشیدہ رہتا ہے، انعام نظر آجاتا ہے اور اکثر سمجھ میں بھی آجاتا ہے۔

یہ تھا دنیا والوں کی نظر میں محبت کا وہ آغاز جو خواجہ صاحبؒ کی طرف سے ہوا۔ اب اظہار محبت کا وہ احوال جو بابا صاحبؒ کی جانب سے دنیا والوں کو نظر آیا۔ ۶۶۷ھ (مطابق ۶۹-۱۲۶۸ء) کا کوئی دن تھا جب ۸۷ سالہ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ پہلی بار ۲۰ سالہ نظام الدین کو اجودھن میں دیکھتے ہیں۔ آنے والا بظاہر اجنبی ہے۔ وفورِ محبت اور رعبِ شیخؒ سے اس کی فصیح البیان زبان گُنگ ہے۔ اس یادگار ملاقات میں گفتگو کا آغاز بابا صاحبؒ کی طرف سے ہوتا ہے اور گنج بار ہونٹوں سے، شکر جیسی میٹھی آواز میں یہ شعر نکلتا ہے اور اَمر ہوجاتا ہے۔

اے آتشِ فراقت دِلہا کباب کردہ
سیلابِ اشتیاقت جانہا خراب کردہ

شعر کا مطلب ہے کہ تیری جدائی کی آگ نے دلوں کو جلا کر راکھ کر دیا ہے اور تجھ سے ملنے کے شوق کے سیلاب نے جانوں کو خراب کر دیا ہے۔ معلوم ہوا کہ آنے والا لگتا تو اجنبی ہے لیکن اجنبی ہے نہیں۔ تعارف کی ضرورت یوں نہیں پڑی کہ بات معرفت کی ہے۔

جب یہ شعر پڑھا گیا اس وقت بابا صاحبؒ کے نام کا ڈنکا پورے برصغیر میں بج رہا تھا اور علماء اور طالبان علم اجودھن میں ان کے جماعت خانے کا رخ کر رہے تھے۔ ''تاریخ فیروز شاہی'' کے تاریخی الفاظ میں:

> ''انہوں نے اس خطۂ زمین کے لوگوں کو اپنی پناہ اور اپنے سایے میں لے رکھا تھا...... وہ قطب عالم اور مدارِ جہاں تھے۔ ان کے قرب اور برکت انفاس سے لوگ دین و دنیا کے مصائب سے نجات پاتے تھے اور جو اس کے اہل تھے، وہ ان کی ارادت کے طفیل بلند درجات پر فائز ہوتے تھے''۔

بابا صاحبؒ کی اس شہرت اور عظمت کے پس منظر میں مندرجہ بالا شعر کے جذباتی الفاظ پر دوبارہ غور کیجیے جو ایک غیر معروف نوجوان پر نظر پڑتے ہی ان کی زبان سے بے ساختہ نکلتے ہیں۔ یہ الفاظ تب ہی اس بے ساختگی سے نکلیں گے جب اجودھن میں بھی محبت کی وہی آگ دہک رہی ہو اور عشق کا وہی سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا ہو جو آٹھ برس پہلے، بدایوں میں ایک بارہ سالہ لڑکے کی زبان سے ہر نماز کے بعد، دس دس بار ''شیخ فریدالدین'' اور ''مولانا فریدالدین'' کا وِرد کرا چکا تھا۔

اسی چاہت کی ایک اور مصدقہ مثال وہ من موہنے القاب ہیں جن سے بابا صاحبؒ نے اپنے سب سے لاڈلے بیٹے شیخ نظام الدین اور اپنے سب سے چہیتے مرید اور خلیفہ خواجہ نظام الدینؒ کو نوازا تھا۔ بیٹے کو بلانا ہوتا تو ''فرزند نانی'' کہہ کر بلاتے لیکن مرید کو بلاتے تو ''فرزند جانی'' کہہ کر یاد کرتے۔ وفات سے کوئی چھ ماہ قبل اجودھن میں نماز جمعہ کے بعد ''فرزند جانی'' کو خصوصی طور پر طلب کیا گیا۔ یہ طلبی خدا جانے کس کے کہنے پر ہو رہی تھی؟ اپنا متبرک لعاب دہن فرزند جانی کے

منہ میں ڈالا اور یہ تاریخی الفاظ کہے جو رہتی دنیا تک جگمگاتے رہیں گے:

''مولانا نظام الدین! دین اور دنیا میں سے جو کچھ یہاں تھا، وہ تمہیں دے دیا گیا۔ اب دلی جاؤ اور ہندوستان پر راج کرو''۔

اور پھر سلطان جیؒ سے جنہیں ان الفاظ کے ساتھ برصغیر پاک و ہند کی روحانی سلطنت عطا کر دی گئی تھی، اپنی اَزلی اور اَبدی محبت کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''میرے لیے تیری ایک نظر کافی ہے''۔

باباصاحبؒ کو خواجہ صاحبؒ سے جو محبت تھی، اس کی ایک جھلک ہم نے دیکھ لی۔ خواجہ صاحبؒ کے دل میں عشق فرید کا جو شعلہ لڑکپن سے بھڑکا تھا اس کا مختصر سا ذکر بھی ہو گیا۔ اب درمیان کے بہت سے واقعات چھوڑ کر بات کو خواجہ صاحبؒ کے بڑھاپے پر ختم کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات صراحت سے بتانی ہے کہ جب شعبان ۷۰۷ھ (۱۳۰۸ء) میں ''فوائدالفواد'' کی قلم بندی کا آغاز ہوا تو خواجہ صاحبؒ، قمری تقویم کے حساب سے ۶۰ برس کے تھے اور شعبان ۷۲۲ھ (۱۳۲۲ء) میں جب آخری گفتگو قلم بند ہوئی تو خواجہ صاحبؒ ۷۵ برس کے پیٹے میں تھے۔ تاہم اس بڑھاپے میں بھی وہ باباصاحبؒ سے ایسی ٹوٹ کر محبت کرتے تھے کہ ادھر باباصاحبؒ کا نام آتا، ادھر خواجہ صاحبؒ کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اس ضمن میں فوائدالفواد سے تین واقعات اختصار سے پیش ہیں۔ پہلے موقع پر خواجہ صاحبؒ کی عمر قمری تقویم کے مطابق ۶۳ برس تھی۔ دوسرے موقع پر ۶۶ برس اور تیسرے موقع پر ۶۹ برس۔

پہلا واقعہ ۲۷/ ربیع الاول ۷۱۰ھ (۲۴/ اگست ۱۳۱۰ء) کا ہے۔ ۶۳ سالہ خواجہ صاحب سے پوچھا گیا کہ کیا وہ باباصاحب کے انتقال کے وقت ان کے پاس تھے؟ خواجہ صاحبؒ کی آنکھیں بھیگ گئیں، فرمایا کہ نہیں۔ مجھے تو کوئی تین ماہ پہلے شوال ہی میں اجودھن سے دلی بھیج دیا تھا۔ اسی مجلس میں خواجہ صاحبؒ کے منہ سے ایک فقرہ نکلتا ہے جو خواجہ صاحبؒ اور باباصاحبؒ کے باہمی تعلقات کے دوسرے انتہائی اہم پہلو کو اجاگر کرتا ہے اور وہ ہے: اپنے شیخ کا انتہائی ادب اور حد درجہ احترام۔

پس منظر یہ ہے کہ ۹۰ سالہ باباصاحبؒ سخت بیمار ہیں۔ اتنے بیمار کہ شرعی رُو سے آپ

پر روزے معاف ہیں ۔ اجودھن میں گرمی کا اور خربوزوں کا موسم ہے اور بابا صاحبؒ ماہِ رمضان میں وقت افطار سے پہلے ایک خربوزہ کھا رہے ہیں ۔ اس واقعے کے گزر جانے کے ۴۰ برس بعد خواجہ صاحبؒ اس کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی زبان سے یہ نہیں نکلتا کہ بابا صاحبؒ نے اپنی زندگی کے آخری ماہِ رمضان میں سخت بیماری کی وجہ سے اور شرع کی اجازت کے مطابق روزہ نہیں رکھا، خواجہ صاحبؒ کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:

''رمضان کا مہینہ آیا تو حضرت (بابا صاحبؒ) افطار فرماتے تھے''۔

اللہ اکبر! بابا صاحبؒ خود کہہ رہے ہیں کہ شریعت کی طرف سے انہیں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے، اس لیے وہ اس دن روزے سے نہیں ہیں لیکن ۴۰ برس بعد بھی ۶۳ سالہ خواجہ صاحبؒ کی زبان سے روزہ نہ رکھنے کے الفاظ کی بجائے یہ الفاظ نکل رہے ہیں کہ ''روزہ افطار فرماتے تھے''۔

دوسرا واقعہ ۲۲/صفر ۷۱۳ھ (۱۸/جون ۱۳۱۳ء) کا ہے ۔ ۶۶ سالہ خواجہ صاحبؒ، بابا صاحبؒ کی حیات کے دوران منعقد ہونے والی ایک محفل سماع کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قوال نے یہ شعر پڑھا ؎

مخرام بدیں صفت مُبادا
کہ از چشم بدت رسد گزندے

غالبؔ کی نوائے سروش میں اس صریر خامہ کا مفہوم جزوی طور پر یوں ادا ہوگا ؎

دیکھو تو دل فریبیٔ انداز نقشِ پا
موجِ خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

یہ شعر سن کر سامع کا خیال معاً کسی الھڑ جوانی کی طرف جاتا ہے لیکن سات سو سال پہلے خواجہ صاحبؒ یہ شعر سنتے ہیں تو ان کے دماغ پر کسی ناتجربہ کار حسینہ کے تصور کے بجائے ۹۰ سالہ بابا صاحبؒ کا سراپا چھا جاتا ہے ۔ فوائد الفواد میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ شعر سنتے ہی مجھے بابا صاحبؒ کے اخلاق، اوصاف، بزرگی کا کمال اور فضل و لطافت یاد آ گئے اور ایسی رقت طاری ہوئی کہ بیان سے باہر ہے ۔ قوال اس کے بعد دوسرا شعر پڑھنا چاہ رہا تھا لیکن میں اس سے یہی شعر پڑھتے

رہنے کی فرمائش کرتا رہا۔ یہ بتاتے ہوئے خواجہ صاحبؒ زاروقطار رونے لگے جب ان سرخ، معصوم اور خوب صورت آنکھوں سے موتی جیسے آنسو گر رہے ہوں گے تو حاضرین مجلس پر کیا گزری ہوگی؟

تیسرا واقعہ ۲۰/ ربیع الثانی ۷۱۶ھ (۱۲/ جولائی ۱۳۱۶ء) کا ہے۔ کوئی جاننا چاہے کہ "فنا فی الشیخ" کسے کہتے ہیں تو یہ چند سطور پڑھ لے:

"شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز کے انتقال کے بعد مجھ پر حج کے شوق نے بہت غلبہ کیا۔ میں نے کہا کہ پہلے اجودھن جا کر شیخ کی زیارت سے تو مشرف ہولوں۔ شیخ کی زیارت ہوئی تو میرا مقصود مجھے مل گیا بلکہ کچھ زیادہ ہی ملا۔ اس کے بعد ایک بار پھر خواہش ابھری۔ میں پھر پہلے شیخ کی زیارت کے لیے اجودھن پہنچ گیا اور مقصود پھر حاصل ہو گیا"۔

فوائد الفواد کے اس حسین تذکرے کے ساتھ یہ ختم نہ ہونے والا ذکر فی الحال ختم کیا جاتا ہے۔

یار زندہ صحبت باقی

حوالہ جات کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ (معارف)

فارم IV (رول نمبر ۸)

نام رسالہ: معارف، اعظم گڈھ

نام پریس:	معارف پریس، اعظم گڈھ	نام پبلیشر:	عبدالمنان ہلالی
مقام اشاعت:	دارالمصنّفین، اعظم گڈھ	قومیت:	ہندوستانی
وقفۂ اشاعت:	ماہانہ	پتہ:	دارالمصنّفین، اعظم گڈھ
نام پرنٹر:	عبدالمنان ہلالی	اڈیٹر:	اشتیاق احمد ظلی
قومیت:	ہندوستان	قومیت:	ہندوستانی
پتہ:	دارالمصنّفین، اعظم گڈھ	پتہ:	دارالمصنّفین، اعظم گڈھ

نام و پتہ مالک رسالہ: دارالمصنّفین، اعظم گڈھ

میں عبدالمنان ہلالی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

عبدالمنان ہلالی

اخبار علمیہ

صحاح ستہ میں کل ۲۹۹۲۸ حدیثیں ہیں، اس میں شامل بیس ہزار حدیثیں مکررات ہیں، ادارہ المعہد الاسلامی نے آسانی کے لیے تکرار حذف کر کے مختصر الکتب الستہ کے نام سے ۹۱۲۶ احادیث پر مشتمل دو جلدیں شائع کردی ہیں، ابواب کی ترتیب بخاری کے مطابق ہے، اس کی رسم اجراء کی تقریبات لاہور، پشاور اور اسلام آباد میں منعقد ہوئیں، یہ اہم کام پروفیسر سید طالب الرحمان شاہ صاحب کی سربراہی میں انجام پایا ہے، دوسری احادیث کو اسی طور پر شائع کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے جن میں ہر موضوع سے متعلق تمام احادیث کو ایک جگہ جمع کردیا جائے گا۔

''کامن گراؤنڈ نیوز'' کے مطابق ترکی کے دانشور مصطفیٰ اکیول نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ جب معاندین اسلام، مذہب اسلام کو پرتشدد مذہب ثابت کرنے کی سازشیں کرتے ہیں تو مسلمان ان کو سمجھنے کے بجائے ان کے خلاف احتجاج کے لیے سڑکوں پر اتر آتے ہیں، جس سے سازشی ذہنوں کو تقویت ملتی ہے، ان کے مطابق پرتشدد احتجاج اسلام کی تعلیمات کے منافی ہے، قرآن مجید ایسے لوگوں سے اعراض کا رویہ اپناتا ہے بصورت دیگر وہ ان سے حسن تعلق کی تلقین کرتا ہے، لہٰذا مسلمانوں کو اس قسم کے احتجاج سے اپنا دامن بچانا چاہیے۔

عربی روزنامہ ''الشرق الاوسط'' سے معلوم ہوا کہ جامعہ ازہر کے صدر مفتی نے فتوی دیا ہے کہ مشہور انٹرنٹ سائٹ ''فیس بک'' کا استعمال مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کیونکہ یہ میاں بیوی کے باہمی تعلق میں خرابی اور ان کی بے راہ روی کا موجب ہے، اس کے اثر سے طلاق کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے، ایک جائزہ کے مطابق مصر میں طلاق کے ہر پانچ واقعات میں ایک فیس بک کی برائی کا نتیجہ ہے۔

پارلیمنٹ برائے مذاہب عالم کی انتخابی کمیٹی نے اپنی صد سالہ تاریخ میں پہلی بار شکاگو

کے امام مجاہد کو آیندہ پانچ برسوں کے لیے اپنا صدر منتخب کیا ہے، اس پارلیمنٹ میں دنیا کے ۲۲۰ مذاہب کے نمائندے شامل ہیں جن کا مقصد مختلف مذاہب کے درمیان مشترکہ اقدار کے توسط سے باہمی قربت کی راہیں تلاش کرنا ہے، اس کا اجلاس ہر پانچ سال بعد ہوتا ہے، امام مجاہد کا انتخاب آسٹریلیا کے مشہور شہر ملبورن کے اجلاس میں کیا گیا۔

سعودی عرب میں خواتین میں دعوتی کام کچھ عرصہ قبل محدود پیمانہ پر شروع ہوا تھا، اب سعودی عرب کی وزارت برائے اسلامی امور براہ راست اس سے دلچسپی لے رہی ہے، ڈاکٹر توفیق بن عبدالعزیز نے بتایا کہ وزارت الدعوۃ خواتین کے لیے ایک دعوتی شعبہ قائم کرنے والی ہے، اس میں صرف داعیات ومبلغات دعوتی کام انجام دیں گی، اس کے لیے وزارت نے ۱۸۰ اور ۱۹۰ خواتین کی دو فہرستیں بھی جاری کی ہیں۔

سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی دینے کا اہم اور تاریخ ساز فیصلہ کیا ہے یعنی یہاں مقیم تمام مسلمانوں کو مذہبی فرائض ادا کرنے میں حکومت تمام سہولتیں فراہم کرے گی اور مساجد کی تعمیر پر بھی کوئی پابندی نہیں ہوگی، فیصل محمد کے بیان کے مطابق اسکارف اور میناروں پر سوئٹزرلینڈ حکومت کی پابندی کے خلاف پرتشدد احتجاج کے بجائے ان کی تنظیم اسلامک آبزرور کنٹریز نے گفتگو اور افہام وتفہیم کی وجہ سے یہ کامیابی حاصل کی۔

امریکی ماہرین نفسیات کے ایک غیر سرکاری ادارے نے ایک جائزے میں کہا ہے کہ بڑھتی عمر کے بارے میں سوچنے سے انسان کی ذہنی پریشانی میں اضافہ ہوتا ہے جس سے انسان بڑھاپے کی جانب اور تیزی سے گامزن ہوجاتا ہے، جو افراد اس احساس سے بالاتر ہوکر زندگی گذارتے ہیں ان کی ذہنی اور جسمانی طاقت جلد زائل نہیں ہوتی۔

اردن میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا جاتا ہے، خبر کے مطابق ۲۰۰۹ء میں ۲۴۱۹ لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے جب کہ اس سے پہلے سالوں ۲۰۰۴ء میں ۳۹۶، ۲۰۰۵ء میں ۴۵۴، ۲۰۰۶ء میں ۴۸۳، ۲۰۰۷ء میں ۴۸۴ اور ۲۰۰۸ء میں

۱۶۰۲ افراد نے اسلام قبول کیا تھا۔

میکسیکو میں ایک قبر ملی ہے جس میں ایک برتن میں ٦ سو برس قدیم انسانی ہڈیاں بھی ہیں، ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ قدیم مایان تہذیب کے باقیات ہیں، جس کا زوال باہمی قبائلی خانہ جنگی کی وجہ سے ۱۲ سو برس پہلے شروع ہو گیا تھا۔

متحدہ عرب امارات نے مقامی اور مہاجر ملازمت پیشہ شہریوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک کتابچہ جاری کیا ہے جس کے نسخے وفاقی حکومت کے تمام محکموں، رضا کارانہ تنظیموں، ملازمتوں اور اشاعتی اداروں میں تقسیم کیے جائیں گے، اس کتابچہ کو عربی، انگریزی، فلپائنی، چینی اور اردو زبان میں بھی شائع کیا جائے گا۔

سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ الشیخ نے خودکش حملوں کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس قسم کے حملوں میں بے گناہ شہریوں کی جانیں جاتی ہیں، یہ عمل قطعی ناجائز اور غیر اسلامی ہے، دہشت گردی ایک مجرمانہ فعل ہے جس سے معاشرہ کا امن وسکون غارت ہوتا ہے، جو اسلام کی روح کے منافی ہے۔

برونئی، دارالسلام کی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں ''اسلام اور امن عالم'' کے نام سے منعقد کانفرنس میں اظہار خیال کیا گیا کہ اگر دنیا میں حقیقی فلاح و بہبود قائم کرنا ہے تو معیشت کے اسلامی اصولوں کو اپنانا پڑے گا، یہ توقع بھی ظاہر کی گئی کہ بالآخر دنیا معاشیات کے اسلامی اصولوں کو اپنانے پر مجبور ہوگی، یہ بھی کہا گیا کہ ماحولیات سے نمٹنے کے لیے اقوام عالم میں اتفاق نہیں، پانی اور زمین کے تنازعات آج بھی ہیں، حکومتیں قومی دفاع پر سب سے زیادہ اور انسانوں کی آسائشوں اور راحتوں پر سب سے کم توجہ کر رہی ہیں، یہ سب معاشی خودغرضی کا نتیجہ ہے، ایسے میں اسلام کے بہترین معاشی اصول ہی سب سے کارآمد متبادل ہیں۔

ک، ص اصلاحی

ادبیات

نعت

جناب رہبؔر تابانی دریابادی

زلف واللیل ہے والشّمس ہے چہرہ تیرا
شرح قرآن مقدس ہے سراپا تیرا

وجہ تخلیق دو عالم ہے تری شخصیت
ذہن انساں نہیں کر سکتا احاطہ تیرا

تجھ کو حاصل ہے دو عالم پہ تصرف کا شرف
"بس کہ محبوب و محبّ میں نہیں میرا تیرا"

چند ہی گام سہی چل کے تو دیکھے کوئی
منزلیں بخشتا ہے نقش کفِ پا تیرا

تو نے جس شان سے اس وقت کیا تھا رائج
اب بھی چلتا ہے اسی شان سے سکہ تیرا

نہ تکلف نہ تصنع نہ بناوٹ کوئی
پھر بھی رکھتا ہے کشش اسوۂ سادہ تیرا

ایک اک ذرے میں سو سو نظر آئے سورج
عین گنجینۂ انوار ہے صحرا تیرا

اک نظر اس پہ بھی اسے رحمت عالم کر دے
رہبؔر زار بھی ہے چاہنے والا تیرا

محلّہ چھپی، دریاباد، ضلع بارہ بنکی، ۲۲۵۴۰۳۔

مطبوعات جدیدہ

مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری اور عصر حاضر: مرتبہ جناب محمد ہارون، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۲۸، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتہ: مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن، ۸- پہلا منزلہ، ہندوستان بلڈنگ ۱۰/ ۲ ٹی پی اسٹریٹ، ممبئی، مہاراشٹر۔

مولانا عبدالسلام ندوی کا علم و فضل اور ان کی غیر معمولی تصنیفی و تالیفی صلاحیت و قدرت محتاج بیان نہیں، اسوۂ صحابہؓ و صحابیاتؓ، سیرت عمر بن عبدالعزیز، امام رازی، حکمائے اسلام، شعرالہند اور اقبال کامل جیسی کتابوں کے ذریعہ انہوں نے علوم اسلامیہ ہی نہیں انسانی تہذیبی سرمایے میں اضافہ کیا، وہ علامہ شبلی کے تربیت و صحبت یافتہ اور اس مثلث کا ایک جز و تھے جس کے بقیہ دو زاویے مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی تھے، ان کی تحریروں کی آفاقیت ہے کہ وہ عصر اور وقت کی حدود و قیود سے ماوراء ہے، تاریخ، تذکرہ، تصوف، اخلاق، فلسفہ، کلام، تنقید وغیرہ علوم میں ان کے مطالعہ و تحقیق کے ساتھ ان کی فکر اور دانشوری نے ان کی تحریروں کو خاص وقعت عطا کی، ان کی دانشوری کا جوہر اس کے علاوہ اور کیا تھا کہ اخلاق انسانی اور نفوس بشری کی تہذیب و تکمیل کی جائے کیونکہ دنیا میں جو اللہ کا خلیفہ بن کر آیا وہ اسی تہذیب نفوس انسانی کی ذمہ داریوں سے گراں بار ہو کر آیا، مولانا ندوی کی تصنیفات و تالیفات پر غور کیا جائے تو ان کی اسی دانش نورانی کا وجود، شعوری طور پر نظر آتا ہے، ادہر مولانا کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی بازخوانی کی کئی مبارک کوششیں ہوئیں، ان میں جامعۃ الفلاح میں منعقد ایک مذاکرۂ علمی بھی شامل ہے، زیر نظر کتاب کا عنوان اسی مذاکرے کا موضوع تھا، عصر حاضر کی تعیین سے شاید مقصود یہی تھا کہ گذشتہ صدی کی دانشوری کی ضرورت و اہمیت کا احساس آج بھی عام ہو، حق یہ ہے کہ عصر بے کراں ہے وہ حاضر و موجود کے پیمانوں میں محدود ہو بھی نہیں سکتا لیکن مولانا کی دانشوری چونکہ دانش حقیقی یا نبوی سے مستعار ہے اس لیے وہ ہر عصر و مصر کے لیے ہے وہ فصل گل و لالہ کی پابند نہیں ہو سکتی، ان کو قریب اٹھارہ مقالات میں قرآن مجید، سیر صحابہ، تاریخ، تصوف، اخلاق اسلامی، عربی و اردو زبان و ادب اور اقبالیات کے عنوانوں پر مولانا کی صہبائے قلم کے کیف و کم کو پیش کر دیا گیا ہے، اس بازخوانی یا دانش برہانی کی بازیابی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مولانا کے طرز فکر و ادا کو نئی نسل اپنا کر چراغ سے اور چراغ روشن کرے، کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے، کمپوزنگ کی غلطیاں اس حسن میں چاند کے داغ کی طرح ہیں۔ فاضل مرتب مولانا ندوی کے عقیدت مند عزیز ہیں، عقیدت و قرابت کا انہوں نے حق ادا کر دیا۔

چہرے کا پردہ واجب یا غیر واجب : از پروفیسر خورشید عالم، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۴۱۸، قیمت: ۳۵۰ روپے، پتہ: دارالتذکیر، رحمان مارکیٹ، غزالی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور، پاکستان۔

مسلمان خاتون کے چہرے پر پردہ ہو یا بے پردہ، ہمارے بعض محققین کے نزدیک یہ بحث بھی موجودہ دور فتن میں سنجیدہ اور ضروری قرار پائی، واجب اور غیر واجب کی اس بحث کو متنازعہ قرار دے کر ہر فریق نے دلائل واسباب پیش کرنے میں کمی نہ کی، زیر نظر کتاب بھی اسی کاوش کا ایک نتیجہ ہے جس میں فاضل مصنف نے چہرے کے پردے کے وجوب کی مخالفت کی ہے، ان کے خیالات پاکستان کے رسالہ ''اشراق'' میں ظاہر ہوتے رہے جیسے ''عورت کو سوسائٹی سے کاٹ کر گھر میں بند رکھنا منشائے الٰہی کے خلاف ہے''، ''منہ چھپانے والی عورت دراصل اخلاقی لحاظ سے مرد کو ایک کمزور اور ناقابل اعتبار مخلوق قرار دیتی ہے''، ان خیالات کی تائید میں انہوں نے قرآن مجید سے استدلال بھی کیا، خیالات سامنے آئے تو اس کے جوابات بھی دیے گئے، اس کتاب میں ان جوابات کو بھی ایمانداری سے پیش کردیا گیا ہے، جواب اور جواب الجواب نے کتاب میں مناظرے کا رنگ بھر دیا اور ستر، حجاب، جلباب، غض بصر، زینت ظاہرہ وغیرہ کو بے حجاب کر کے مخالف وموافق خیالات نے چہرے کے پردے کے وجوب کو چہرے کی بے پردگی کے استحباب تک لادیا، فاضل پروفیسر سے فریق مخالف نے گزارش کی کہ '' فتنے کے اس دور میں ایسے مضامین لکھنا حکیمانہ طرز عمل نہیں جس سے فائدہ اٹھا کر اغیار اسلامی معاشرے میں عریانی اور فحاشی کو فروغ دے سکتے ہیں''، وجوب وغیر وجوب کی بحث میں پاسبان عقل کے علاوہ دل سے فتوی لینا بھی کارآمد ہوتا ہے، محض اپنے خیال کے حق و اثبات کا جذبہ کافی نہیں، پروفیسر صاحب نے انتساب اپنی والدہ مرحومہ کے نام اس لیے کیا کہ ''انہوں نے گاؤں اور شہر میں کھلے چہرے کے ساتھ انتہائی پاکیزہ زندگی گزاری'' کتاب کا فائدہ یہ ضرور ہے کہ اس بحث سے تعلق رکھنے والوں کے لیے غیر ضروری باتوں کے ساتھ بعض اہم حوالے اور نکتے بھی سامنے آجاتے ہیں۔

ایمان ویقین کی باتیں: ازمولانا ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۶۰، مفت ہدیہ، پتہ: ندوۃ التالیف والترجمہ، جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ، یوپی۔

زہد وتقوی، استغناء، بے نیازی، امانت و دیانت داری، حق گوئی و بے باکی اور تواضع وفروتنی کے واقعات سے امت مسلمہ کی تاریخ معمور ہے، ان صفحات سے آراستہ رجال واشخاص کو اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت یوں حاصل ہوئی کہ ان کے نقوش تابندہ آج بھی زندہ ہیں اور آیندہ بھی پایندہ رہیں گے، اس کتاب کے فاضل مرتب نے ایسے دل آویز اور نہایت پراثر واقعات ''بصائر وعبر'' کے عنوان سے جمع کیے جو

مختلف اہم رسائل میں شائع بھی ہوئے، اب زیر نظر کتاب میں ان کا ایک حصہ جمع کر دیا گیا ہے، مولف محترم کی شخصیت خود ان عناصر کا مجموعہ ہے اس لیے قول و فعل کی آمیزش نے ان کے بیان میں بلا کی تاثیر رکھ دی ہے، وہ دبستان شبلی کے بہترین نمایندے اور قلم کی شگفتگی کے لیے پہلے سے معروف ہے، نفس مضمون کی پاکیزگی اور قلم کی طہارت و نظافت نے اس کتاب کی ہر سطر کو ایمان و یقین کے لیے سر چشمہ قوت و توانائی کی حیثیت عطا کر دی، خود فاضل اور صوفی منش مصنف کا احساس ہے کہ یہ سبق آموز حکایتیں اور ایمان افروز واقعات دلوں میں ایک جوت روشن کرتے ہیں، ہم ان کی اس توقع میں شریک ہیں کہ ہر قاری اس سے اپنے قلب و روح میں جدت تاثیر محسوس کرے گا، افادۂ عام کے لیے اس بیش قیمت سوغات کو ظاہری قیمت سے بے نیاز رکھا گیا ہے، اصل قیمت تو اللہ کے نزدیک مقبولیت کی ہے۔

اقتصادی غارت گر: از جان پرکنز، مترجم جناب صفوت علی قدوائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت، صفحات ۲۳۲، قیمت: ۱۵۰ روپے، پتہ: مکتبہ معارف اسلامی ڈی -۳۵، بلاک -۵، فیڈرل بی ایریا کراچی، پاکستان۔

مغرب اور یہود کی سازشوں کا نتیجہ آج دنیا کے سامنے عالمی کساد بازاری، گرانی، بے روزگاری اور بڑھتی ہوئی غریبی اور مالیاتی اداروں کی شکست و ریخت کی شکل میں موجود ہے، یورپ، امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام کو یہودی عیاری نے دنیا کے لیے ایک ناسور بنا دیا ہے لیکن ظالموں کا فریب اپنی جگہ برقرار ہے خصوصاً ترقی پذیر ملکوں میں انہوں نے اپنے ایجنٹوں کو اقتصادیات و معاشیات کا ماہر قرار دے کر ان ملکوں کی اقتصادی نظام کو یہودیت کے سانچے میں ڈھالنے کی مہم چلا رکھی ہے، اسی مہم کا ایک نمایاں رکن جان پرکنز بھی تھا جو اکنامک ہٹ مین (ای ایچ ایم) کی حیثیت سے عرصے تک دنیا بھر کے ملکوں کو دھوکا دے کر اربوں ڈالر سے محروم کرتی ہے، اس نے خود کو بھی اقتصادی دہشت گرد سے تعبیر کیا ہے لیکن جب اس کا ضمیر جاگا تو اس نے اس مہم سے علاحدگی اختیار کی اور بطور کفارہ اس نے ایسے رازوں کا انکشاف کیا جو امریکہ اور مغربی سرمایہ داروں کے سیاہ کرتوتوں کی طلسم ہوش ربا سے کم نہیں کہ کس طرح عالمی بینک، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور کئی بین الاقوامی امدادی تنظیمیں اور ادارے تیسری دنیا کی معیشت کو جونک کی طرح چوس کر پنپنے نہیں دیتے اور ان ملکوں کے بے غیرت، بدعنوان اور رشوت خور حکمراں، یہودی سودخوروں کے کارندے بن کر اپنے مفادات کی خاطر قوم کی عزت کو نیلام کرتے ہیں، ایکواڈور، پناما، انڈونیشیا، سعودی عرب سے عراق و وینیزولا تک جان پرکنز نے کیا کیا دیکھا، یہ داستان عبرت پڑھنے کے لائق ہے، ایسی کتابوں کا رواج کم ہے لیکن ان کی ضرورت و اہمیت بہر حال کم نہیں۔ ع -ص